جون ۱۹۹۲ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
حکم و عبر (قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
خصوصیاتِ صحابہ کرام (۳)	مولانا اخلاق حسین قاسمی	۳۳
حکمتِ اقبال (۴۲)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۹
تعارف و تبصرۂ کتب	ادارہ	۵۰
لغات و اعراب قرآن (۳۵)	پروفیسر حافظ احمد یار	۵۱
حقوقِ انسانی: سیرتِ طیبہ کی روشنی میں (۲)	سید شبیر حسین زاہد	۶۰

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں علمی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

چھپ کر آگئی ہے ــــ ضرور مطالعہ کیجئے ــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۶۵ روپے ■ غیر مجلد -/۵۰ روپے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۱ — جون ۱۹۹۲ء ذوالحجہ ۱۴۱۲ھ — شمارہ ۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴ - فون ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰ روپے، فی شمارہ ۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

زیر نظر شمارے میں "قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر" کے زیر عنوان مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس اور "حکمت قرآن" کے مدیر مسئول محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک خطابِ جمعہ شامل کیا گیا ہے۔ بعض قارئین کے لئے خطابِ جمعہ کا "حکمتِ قرآن" میں شائع ہونا شاید باعثِ تعجب ہو' مگر ہماری رائے میں محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب اس اعتبار سے بہت اہم اور حکمت قرآن کے لئے نہایت موزوں ہے کہ اس خطاب کا خاکہ (Synopsis) اصلاً مرکزی انجمن کے بیسویں سالانہ اجلاس عام کے لئے مرتب کیا گیا تھا۔ لیکن اس بار چونکہ ذیلی اور منسلک انجمنوں کے نمائندگان بھی شریک اجلاس تھے اور انہیں بھی وہاں خطاب کا موقع دیا گیا لہٰذا وقت زیادہ ہوجانے کے باعث صدر مؤسس نے اپنے خطاب کو آئندہ کسی مناسب موقع کے لئے ملتوی کردیا۔ ۲۴ر اپریل کو محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب جمعہ جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں تھا۔ اور یہ ایک نہایت مناسب موقع تھا کہ وہ باتیں جو انہیں انجمن کے سالانہ اجلاس میں بیان کرنی تھیں' اس موقع پر سامعین کے گوش گزار کردی جائیں اور وہ قرض چکا دیا جائے جس کی ذمہ داری انہوں نے قبول کی تھی--- اس خطاب کا قریباً دو تہائی حصہ زیر نظر شمارے میں شامل ہے' بقیہ ایک تہائی اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ شمارے میں شائع کردیا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

حکمت قرآن کے گذشتہ شمارے میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے بیسویں سالانہ اجلاسِ عام کی روداد شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ میں دو واقعاتی غلطیاں ایسی تھیں جن کی اصلاح ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ اجلاس عام ۲۰ر اپریل ۱۹۹۲ء کو بمطابق ۵ر شوال ۱۴۱۲ھ منعقد ہوا تھا جبکہ رپورٹ میں ۱۴۱۲ھ کی بجائے سہواً ۱۴۱۳ھ شائع ہوگیا تھا۔ اسی طرح رپورٹ کے آغاز میں یہ بات مذکور تھی کہ "۹۰ء کے اجلاس عام کی کارروائی پڑھ کر سنائی گئی"۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ۹۱ء کے اجلاس عام کی کارروائی پڑھی گئی تھی۔ اس سہو پر ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

قرآن حکیم کی قوّتِ تسخیر

اظہارِ تشکر اور تحدیثِ نعمت پر مشتمل
صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

○

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا سالانہ اجلاسِ عام ۲۰ر اپریل کی شام کو منعقد ہوا اور اس سے قبل مسلسل چار دن تک تنظیم اسلامی کا سترہواں سالانہ اجتماع جاری رہا۔ یوں سمجھئے کہ تحریک قرآنی کے اس قافلے نے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے نام سے محوِ سفر ہے' اپنی زندگی کے بیس برس مکمل کر لئے۔ اسی طرح تنظیم اسلامی کی عمر بھی اب سترہ برس ہو گئی ہے۔ اِس عرصے کے دوران جو خیر بھی بن آیا ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق' اور اس کی نصرت و اعانت کے طفیل ہوا' اس پر اس کا جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ احباب جانتے ہیں کہ گذشتہ ایک سال کے دوران متعدد مواقع پر میں چند خاص حقائق کے حوالے سے بعض امور پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کرتا رہا ہوں۔ آج پھر میں چاہتا ہوں کہ انہیں یکجا کر کے اور مرتب انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

تحریک میں تسلسل اور دوام ـــــ ایک لائق شکر بات

سب سے پہلا شکر جو ہم پر واجب ہے وہ اس اعتبار سے کہ ہمارے اس کام میں جس کے یہ دو نمایاں تنظیمی مظہر ہیں یعنی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی' الحمد للہ کہ گذشتہ بیس برس سے تسلسل بھی ہے اور تواتر بھی۔ گو ہماری رفتار کوئی بہت زیادہ تیز نہیں رہی لیکن اس میں جو تسلسل اور تواتر کا پہلو ہے وہ میرے نزدیک بہت اہمیت کا حامل ہے۔ طوفان کی طرح اٹھنے والی تحریکیں بسا اوقات بہت جلد جھاگ کی مانند بیٹھ بھی جاتی

ہیں۔ لیکن جس کام میں تسلسل اور دوام ہو اور جو پیہم کیا جائے اصل میں وہی پائیدار بھی ہوتا ہے اور اسی کے نتیجے میں کوئی حقیقتاً مؤثر اور وقیع کام سرانجام پاسکتا ہے۔ میں نے اس سالانہ اجتماع کے دوران بھی اس ضمن میں دو الفاظ ایک انگریزی محاورے کے حوالے سے استعمال کئے تھے :i) Slow اور ii) Steady۔ ہمارے اب تک کے کام پر یہ دونوں الفاظ منطبق ہوتے ہیں۔ اور اس میں یقیناً ہمارے لئے اطمینان بلکہ بشارت کا بہت کچھ سامان موجود ہے اور ہمیں اس پر تہہ دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور شکر کے لائق بات یہ ہے کہ اس بیس سال کے عرصے میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا' کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا۔ انجمنوں کی زندگیوں میں بڑے بڑے طوفان آتے ہیں' بڑے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں کہ پھر بعض اوقات ادارے کی بساط تک لپیٹنے کی نوبت آجاتی ہے' اس لئے کہ عام طور پر انجمنوں کا نظام بڑا ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے' اس میں بالعموم کچھ سرکردہ شخصیتوں کا ٹکراؤ ہوجایا کرتا ہے اور باہم کھینچ تان عام طور پر جاری رہتی ہے جو نہایت مضر اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ الحمد للہ' ثم الحمد للہ کہ ہمارا یہ ادارہ اس نوع کی خرابیوں سے بالکل محفوظ رہا۔ یہ قرآن اکیڈمی انجمن کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز رہی ہے اور یہاں آس پاس کے رہنے والے بخوبی واقف ہیں کہ ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ الحمد للہ یہاں پیش نہیں آیا۔ گذشتہ بیس سالوں کے دوران مرکزی انجمن کے کسی بھی فنکشن میں' خواہ وہ عمومی اجلاس ہو اور خواہ مجلس منتظمہ کی خصوصی میٹنگ ہو' کبھی کوئی تلخی نہیں ہوئی' کبھی کسی تو تکار کی نوبت نہیں آئی۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے ------ شکر کے بارے میں میں نے بارہا اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جب تک انسان کو پورا شعور حاصل نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر کتنا بڑا فضل اور انعام ہوا ہے' اس وقت تک اس کے متناسب اور Proportionate شکر ادا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ادراک اور شعور کہ مجھ پر اللہ کا کتنا بڑا احسان اور کتنا عظیم فضل ہوا ہے' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جتنا یہ شعور اور احساس گہرا ہوگا اتنی ہی گہرائی سے گویا کہ جذبۂ تشکر برآمد ہوگا اور اسی قدر قوت کے ساتھ یہ جذبۂ شکر ایک چشمہ کی مانند قلب کی گہرائیوں سے ابلے گا۔

کم و بیش اسی طرح کا معاملہ الحمد للہ کہ تنظیم اسلامی کا بھی ہے کہ کوئی بڑا اختلاف

اور انتشار وہاں بھی رونما نہیں ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ انسانوں کی جماعت میں کچھ نہ کچھ لوگوں کا اختلاف کرنا یا اِکّا دکّا لوگوں کا جماعت سے علیحدہ ہو جانا بالکل فطری امر ہے' کوئی بھی جماعت اس سے خالی نہیں رہی' یہاں تک کہ انبیاء کرام کی جماعتوں میں بھی ایسے لوگ نکل آتے تھے کہ جو ساتھ چھوڑ جاتے تھے تو تنظیم اسلامی کے اندر بھی اس طرح کے چند واقعات کا ہونا موجبِ حیرت یا باعثِ تشویش نہیں ہونا چاہیے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں کئی مواقع ایسے آئے کہ بعض لوگ متزلزل ہوئے یا ساتھ چھوڑ گئے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ واقعۂ معراج کے بعد متعدد وہ مسلمان جو ابھی نئے نئے ایمان لائے تھے اور ایمان میں پختہ نہیں ہوئے تھے' متزلزل ہو گئے تھے۔ اسی طرح حضرت ام حبیبہؓ کے شوہر جو صاحبِ ایمان تھے اور اپنی اہلیہ سمیت حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے' وہاں جا کر مرتد ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ شوہر کے مرتد ہو جانے کے بعد حضرت ام حبیبہؓ چونکہ اس کے نکاح میں نہیں رہیں تو پھر حضورؐ نے ان کی دلجوئی کے لئے مدینہ منورہ سے نکاح کا پیغام بھجوایا' اس لئے کہ وہ قریش کے ایک بہت بڑے سردار ابو سفیان کی صاحبزادی تھیں۔ اور اس حوالے سے ان کا جو مقام و مرتبہ تھا اس کے پیش نظر حضورؐ نے مناسب سمجھا کہ خود نکاح کریں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ حضورؐ کی طرف سے مہر بھی حضرت نجاشیؓ نے ادا کیا تھا۔ اس لئے کہ بوقت نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور حضرت ام حبیبہؓ ابھی حبشہ ہی میں تھیں' وہ پھر بعد میں مدینہ تشریف لائی تھیں۔

بہر حال میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں کہ کچھ نہ کچھ لوگوں کی تو اس طرح آمد و رفت رہتی ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بہت کم تھی اور آج کے دور میں غلبہ و اقامتِ دین کے لئے جو بھی تحریک اٹھے گی اس میں یقیناً ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہوں گے' لیکن الحمد للہ تنظیم اسلامی کو قائم ہوئے سترہ برس ہو چکے ہیں' اس میں کوئی بڑا ہنگامہ یا کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا' کسی بڑی تعداد میں لوگوں کی اس سے علیحدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا' اور یہ چیز یقیناً ایسی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ادراک اور شعور کرتے ہوئے کہ ہمارے اس کام کی رفتار گو کم رہی لیکن اس میں دوام' تسلسل اور تواتر رہا ہے' اپنے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کرنا

چاہیے۔ اس لئے کہ اگر یہ قافلہ اسی دوام اور تسلسل سے چلتا رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ پائیدار نتائج کے برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

توازن و اعتدال ـــــ ایک اہم وصف

دوسری بات جس پر ہمیں صمیم قلب کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور خاص طور پر میں اپنی ذات کے حوالے سے بار بار اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں' یہ ہے کہ جیسے ہماری تنظیم میں تسلسل اور تواتر موجود ہے اسی طریقے سے توازن اور اعتدال کا وصف بھی الحمد للہ یہاں پایا جاتا ہے۔ اور یہ وصف اپنی جگہ نہایت ضروری بھی ہے اور اہم بھی۔ اکثر تحریکوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مرحلے کے بعد جب دوسرے مرحلے میں وہ تحریک داخل ہوتی ہے تو پہلے مرحلے کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔ جیسے ایک انسان جب سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ جائے تو پھر سیڑھی کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں رہتی' اس لئے کہ جو مقصد اس سے حاصل کرنا تھا وہ حاصل کرلیا۔ الحمد للہ کہ ذاتی طور پر میں اس معاملے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام شروع کیا تھا اس میں ابتدائی چھ سات برس میں نے تنہا کام کیا۔ انجمن خدام القرآن کا اُس وقت وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں یہ انجمن قائم ہوئی۔ پھر ۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ تو درحقیقت یہ دو کام ہیں جو قریباً متوازی اور متساوی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی میں کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلے کام کا عنوان ہے "دعوت رجوع الی القرآن" جس کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی اور دوسرا کام جس کے لئے تنظیم اسلامی تشکیل دی گئی ہے' غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اب بھی میری توانائیوں کا کافی بڑا حصہ پہلے کام یعنی دعوت رجوع الی القرآن میں کھپ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ میں نے سمجھا ہو کہ اس کام کا تعلق تو میرے جوانی زندگانی کے ابتدائی مرحلے سے تھا اور اب تو تحریک' تنظیم اور انقلاب ہی کی طرف مجھے پوری طرح متوجہ ہوجانا چاہیے۔ الحمد للہ کہ اس معاملے میں میرا طرز عمل توازن و اعتدال پر مبنی رہا ہے۔

'اتمام نور' اور 'غلبہ دین حق' : گاڑی کے دو پہیے

اس سال ملتان میں دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران پہلی مرتبہ میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ قرآن مجید میں دو مقامات پر گاڑی کے ان دو پہیوں کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ یہ محاورہ کہ گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ اگر ایک پہیہ جام ہوجائے گا تو گاڑی گھومنے لگے گی' آگے نہیں بڑھے گی' دونوں پہیے چل رہے ہوں تو پھر گاڑی کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ ایک خط مستقیم میں آگے کی طرف پیش قدمی کرسکے۔ گاڑی کے جن دو پہیوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کا تذکرہ سورۃ التوبہ میں بھی اور سورۃ الصف میں بھی بالکل ساتھ ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الصف کی یہ آیات تو اکثر حضرات کو یاد ہونگی اور ان کا مفہوم بھی ذہن میں ہوگا:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○

اور سورۃ التوبہ کے الفاظ یہ ہیں:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○

ذرا غور کیجئے' قرآن حکیم کے یہ دونوں مقامات اسلوب کے اعتبار سے کتنے مشابہ ہیں' بلکہ الفاظ بھی کم و بیش بالکل ایک سے ہیں' صرف پہلی آیت کے بعض الفاظ ایک دوسرے سے کچھ مختلف نظر آتے ہیں' ورنہ آیت کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یہاں دو مقاصد کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ یہ دو کام اب پورے ہو کر رہیں گے چاہے مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو اور چاہے کافروں کو کتنا ہی ناپسند ہو !! ایک مقصد ہے اتمامِ نور جس کے لئے سورۃ الصف میں الفاظ آئے: وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کہ اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی ناپسند ہو۔ اور دوسرا کام یا دوسرا

مقصد اگلی آیت میں بیان ہوا جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ دین حق کو غالب کرے خواہ یہ چیز مشرکوں کو کتنی ہی ناپسند ہو! ـــــ یہ بات سورۃ التوبہ میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں آئی ہے' ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے: "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○"

پہلی آیت میں تھوڑا سا لفظی فرق موجود ہے۔ سورۃ الصف میں فرمایا: "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا" جبکہ سورۃ التوبہ میں "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا" کے الفاظ آئے۔ یعنی ایک حرفِ ناصب کی جگہ دوسرا حرفِ ناصب آگیا۔ اسی طرح سورۃ الصف میں "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کے الفاظ ہیں جبکہ سورۃ التوبہ میں اسی مفہوم کو "وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ" کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا' جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ بہر طور اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناپسند ہو!

گاڑی کے انہی دونوں پہیوں کو جمع کیا گیا سورۃ المائدہ کی اس عظیم آیت میں جو بڑی مشہور ہے اور جس کے بارے میں یہود کے بعض علماء نے کہا تھا کہ اے مسلمانو' یہ آیت جو تمہیں عطا ہوئی ہے اگر ہمیں عطا ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو اپنا سالانہ جشن اور سالانہ عید قرار دیتے۔ اس آیت کے الفاظ پر توجہ کو مرکوز کیجئے۔ فرمایا: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" ـــــ وہی دونوں چیزیں یہاں جمع کر دی گئیں: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے "دین" کو کامل کر دیا' یعنی وہ دین حق جس کا غلبہ و اظہار بعثت محمدیؐ کا اصل مقصد ہے' آج مکمل ہو گیا' وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا۔ اس سے مراد ہے نورِ ہدایت کا اتمام اور تکمیل جس کا ذکر سورۃ الصف میں "مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کے الفاظ میں وارد ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اتمامِ نور یعنی اتمامِ ہدایت ہی درحقیقت اتمامِ نعمت ہے۔ گویا اصل نعمت ہے ہی نعمتِ ہدایت! دنیا کی کوئی شے نعمت نہیں ہے جب تک کہ نعمتِ ہدایت اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ نعمتِ ہدایت کے بغیر دولت' صحت' اولاد' اقتدار غرضیکہ کوئی شے نعمت نہیں ہے بلکہ یہ سب عذاب کا موجب بن جانے والی چیزیں ہیں' ان کا غلط استعمال انسان کو ہلاکت و بربادی سے

دوچار کرے گا۔ ہاں اگر ہدایت ہو تو اولاد بھی نعمت ہے' پھر دولت بھی ایک عظیم نعمت سے کم نہیں کہ انسان اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا' اسی طرح ہدایت اگر ہو تو صحت بھی نعمت ہے کہ انسان اللہ کے دین کے لئے بھاگ دوڑ کرے گا' محنت اور مجاہدہ کرے گا۔ نعمتِ ہدایت کے ساتھ ذہانت بھی ایک نعمت شمار ہوگی کہ اس کا استعمال اللہ کے دین کے لئے ہوگا ورنہ یہی ذہانت انسان کو Evil Genius بنادے گی اور انسان کی اخروی تباہی کا ذریعہ بن جائے گی۔ تو معلوم ہوا کہ اصل نعمت ہے نعمتِ ہدایت!

ایک قابل لحاظ فرق

اب یہ بات نوٹ کیجئے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو نورِ ہدایت بھی مکمل ہوگیا اور دین حق کا غلبہ و اظہار بھی سرزمین عرب تک مکمل ہوگیا' گویا گاڑی کے یہ دونوں پہیے مساوی انداز میں ساتھ ساتھ چلتے اور بڑھتے رہے' لیکن حضورؐ کے دَور کے بعد ان دونوں چیزوں کے درمیان ایک فرق واقع ہوگیا۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

دیکھئے اتمامِ نور تو ہوا قرآن کی شکل میں کہ ۲۳ برس میں قرآن حکیم کا نزول مکمل ہوا اور اسطرح اتمامِ نور ہوگیا اور اس نور کو محفوظ کرلیا گیا قیامت تک کے لئے کہ اس میں اب کہیں کوئی تحریف نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اقامتِ دین کے مرحلہ کی تکمیل کا کام جس کے لئے سورۃ الصف میں "اظہار دین الحق علی الدّین کلّہٖ" کی اصطلاح آئی ہے' حضورؐ کے زمانے میں ایک حد تک ہو گیا تھا کہ اندرونِ ملک عرب دینِ حق کا پرچم لہرانے لگا۔ پھر دور خلافتِ راشدہ میں اسکی توسیع بڑے بھرپور انداز میں ہوئی لیکن پھر ایک وقت آیا کہ یہ عمل رک گیا' بلکہ رفتہ رفتہ دین کی یہ عالیشان عمارت منہدم ہونے لگی یہاں تک کہ بالکل زمیں بوس ہو گئی۔ اب صورت یہ ہے کہ اسلام محض ایک مذہب کے طور پر تو باقی ہے لیکن دین حق اور نظام اسلام اپنی صحیح صورت میں زمین کے کسی ایک خطے میں بھی قائم و نافذ نہیں' اور اب غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد ہمیں از سرِ نو کرنی ہوگی ——— تو یہ ہے وہ بڑا فرق جو اس معاملے میں واقع ہوا کہ دونوں کام جو نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے دور میں گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ساتھ ساتھ چل رہے تھے' بعد میں ہم آہنگ نہ رہ سکے۔

اتمام نور کے ضمن میں ہماری ذمہ داری

جہاں تک نور ہدایت کے اتمام کا تعلق ہے ہم مسلمانوں کے لئے یہ کتنی بڑی سہولت ہے کہ ہمیں پورا یقین اور اعتماد ہے کہ اس "کتاب" میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اسکی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" (ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ قرآن حکیم اپنی جگہ خود بھی اللہ کی عظیم ترین نعمت ہے اور اللہ کا مزید فضل و کرم ہم پر یہ ہوا کہ اسکی حفاظت کا ذمہ بھی اس نے لے لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس نعمت کی قدر نہیں ہے اور ہم دنیا کی حقیر سی چیزوں کو اس نعمتِ عظمیٰ پر ترجیح دیتے ہیں' بہرکیف پہلے کام یعنی "اتمامِ نور" کے ضمن میں ہمارے ذمے صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ نورِ ہدایت موجود ہے' اسے عام کیا جائے' اس کا افشاء کیا جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ چراغ جلا کر بلندی پر رکھا جاتا ہے' اسے نیچے کہیں چھپا کر نہیں رکھا کرتے۔ چراغ اگر بلندی پر ہوگا تو ماحول کو منور کرے گا' اسکی روشنی پھیلے گی۔ تو نور ہدایت کا عام کرنا' اس سے ماحول کو منور کرنا اور اس کا افشاء کرنا ہمارے ذمے ہے۔ یہی بات اس حدیث نبوی میں آئی ہے جو حضرت عبیدہ ملیکی سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ" اے قرآن والو' قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا' اسے محض ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ بلکہ: "وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ" اس کی تلاوت کیا کرو جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' رات اور دن کے اوقات میں۔ "وَاَفْشُوْہُ" اسے عام کرو' اسے پھیلاؤ' چہار دانگ عالم تک اس کا نور پہنچا دو!

اسی بات کا ایک منطقی نتیجہ اور بھی نکلتا ہے جس کا ذکر عظمتِ قرآن کے بیان میں اس طویل حدیث میں آیا ہے جس کے راوی حضرت علیؓ ہیں۔ اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: "وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدٰی مِنْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ" کہ جو شخص اس قرآن کو چھوڑ کر کہیں

اور سے ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کردے گا۔ جب ہدایت و رہنمائی کا اتنا حتمی اور یقینی منبع و سرچشمہ اور اتنا مکمل source (ذریعہ) تمہارے پاس موجود ہے' تو اس کے ہوتے ہوئے ہدایت و رہنمائی کے لئے دائیں بائیں دیکھنا گویا انتہا درجے کی ناقدری ہی نہیں قرآن مجید کی توہین کے مترادف ہے۔ البتہ اس کا یہ مفہوم سمجھنا بھی درست نہ ہوگا کہ قرآن کے سوا کچھ اور پڑھنا ہی نہیں چاہیے! اور چیزوں کا مطالعہ کیجئے' تورات پڑھئے' انجیل پڑھئے' لیکن انہیں منبع و سرچشمۂ ہدایت سمجھ کر نہیں بلکہ محض اپنی معلومات میں اضافے کے لئے ان کا مطالعہ کیجئے۔ وہ اسی کتاب ہدایت کے سابقہ ایڈیشن ہیں جس کا تکمیلی ایڈیشن قرآن حکیم ہے۔ اسی طرح دوسرے علوم بھی اپنی معلومات میں اضافے کے لئے پڑھے جا سکتے ہیں بلکہ دوسرے علوم کو قرآن مجید کے فہم کا ذریعہ سمجھ کر سیکھئے اور پڑھئے۔ اس لئے کہ انسانی ذہن کا ظرف جتنا وسیع اور کشادہ ہوگا اسی کی مناسبت سے قرآن مجید سے ہدایت اور علم و معرفت کے موتی انسان اپنے دامن میں سمیٹ سکے گا۔ دامن ہی اگر تنگ ہو تو انسان کے حصے میں حکمت و معرفت کے موتی بھی پھر کم ہی آئیں گے۔ ع "پھول کھلے ہیں گلشن گلشن' لیکن اپنا اپنا دامن!" قرآن مجید کے اندر تو ہدایت' علم اور معرفت کی کوئی کمی نہیں' ان کے جواہر سے یہ معدن بھرا پڑا ہے لیکن تمہاری اپنی تنگ دامانی آڑے آجائے تو اس کا کیا علاج!

واضح رہے کہ دوسرے علوم کے ذریعے سے قرآن مجید کی حقانیت کا مزید مبرہن ہو جانا خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۃ حٰمٓ السجدہ میں فرمایا: "سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ" کہ ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔ آفاق میں بھی اور انفس میں بھی' حتیٰ کہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن مجید ہی سراسر حق ہے۔ گویا کہ جتنا انسان کے علم کا دائرہ وسیع ہوگا قرآن مجید کی حقانیت اسی درجے میں مزید مبرہن ہو جائے گی' اسی قدر اس کا اثبات زیادہ ہوگا۔ اِن اعتبارات سے دوسرے علوم سے اعتناء کرنے یا ان سے دلچسپی رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایک بندۂ مومن کیلئے لازم ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ منبع ہدایت سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وارننگ ہمیشہ اس کے پیش نظر رہنی چاہئے کہ: "وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهٖٓ اَضَلَّهُ اللّٰهُ"

خلاصۂ کلام یہ کہ اس اعتبار سے تو اتمامِ نور ہوگیا کہ قرآن حکیم کا نزول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوا اور اللہ نے قیامت تک کے لئے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا لیکن اس ضمن میں ایک کام ہمارے ذمے باقی ہے اور وہ ہے اس نورِ ہدایت کا عام کرنا جس کے لئے حدیث میں "وَاَفْشُوْہُ" کا لفظ آیا تھا کہ اسے پھیلاؤ اور عام کرو ـــــ اور یہ افشاء ہر سطح پر ہوگا' عوام کی سطح پر بھی اسے پھیلانا ہوگا اور خواص کی سطح پر بھی' فلسفیوں اور دانشوروں تک بھی اس کے ابلاغ کا حق ادا کرنا ہوگا اور شریر اور جھگڑالو لوگوں پر بھی مجادلۂ حسنہ کے ذریعے حجت قائم کرنی ہوگی۔ یہ سب افشاء ہی کی مختلف سطحیں ہیں!

گاڑی کا دوسرا پہیہ : غلبہ دین کی جدوجہد

اس گاڑی کا جو دوسرا پہیہ ہے یعنی غلبۂ دینِ حق' اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک حضور پاک کی حیاتِ طیبہ میں "وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" کی شان ظاہر ہوئی اور دین حق کا غلبہ ملکِ عرب کی حد تک مکمل ہوگیا۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دوران کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے رقبے پر دین حق غالب و نافذ ہوا اور اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ لیکن پھر اس معاملے میں زوال کا آغاز ہوگیا اور تدریجاً زوال کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ یوں سمجھئے کہ سب سے پہلے قصرِ اسلام کی چھٹی منزل گری' پھر پانچویں منزل منہدم ہوئی' پھر چوتھی اور پھر تیسری' اور اس طرح آج سے قریباً ڈیڑھ دو سو برس قبل پوری عمارت زمین بوس ہوگئی۔ چنانچہ اب اس کی تعمیرِ از سرِ نو کرنی ہوگی۔ بہر کیف اس وقت صرف اسی نکتے کی جانب متوجہ کرنا مقصود تھا کہ یہ دو کام بالکل متوازی (Parallel) ہیں' قرآن مجید نے دونوں مقامات پر یعنی سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں ان دونوں کو باہتمام یکجا بیان کیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ ان دونوں کاموں کو متوازی اور تساوی انداز میں آگے بڑھایا جائے۔ ان میں توازن و اعتدال برقرار رہنا چاہیے اور اس پر بھی میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں' کم ہے کہ اس کے فضل و کرم کے طفیل یہ دونوں چیزیں ہمارے یہاں بالکل تساوی اور متوازی شکل میں چل رہی ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کے تحت قائم ہونے والی قرآن اکیڈمی اور اسی طرح

ذیلی انجمنیں اور ذیلی اکیڈمیاں جو وجود میں آ رہی ہیں یہ سب درحقیقت ہماری گاڑی کے ایک پہیے کے مظاہر ہیں جو الحمد للہ نہ صرف یہ کہ ایک تسلسل کے ساتھ رواں دواں ہے بلکہ اس کی رفتار میں بتدریج اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ دوسرا پہیہ تنظیم اسلامی سے عبارت ہے جسکی حرکت کو تیز کرنے کے لئے ہم نے تحریکِ خلافت کا عنوان اختیار کیا ہے۔ لیکن تنظیم اسلامی اور تحریکِ خلافت اصلاً ایک ہی کام کے دو گوشے یا دو مرحلے ہیں اور اس تمام تر کام کا ہدف ایک ہی ہے اور وہ ہے دینِ حق کا غلبہ و اقامت۔ تو فی الاصل کام دو ہی ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی اور Parallel ہیں۔ ایک ہے رجوع الی القرآن کی دعوت جس کے لئے مرکزی انجمن سرگرم عمل ہے اور دوسرا ہے اقامت دین کی جدوجہد جس کے لئے تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت بر سر عمل ہیں۔

تحریک رجوع الی القرآن کا تسلسل برقرار رہے گا!

ایک اور لائق شکر اور قابل اطمینان پہلو

تیسری بات کہ جس پر میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں اور جس کا بارہا میں نے ذکر بھی کیا ہے، وہ یہ کہ اس کام کے باقی اور جاری رہنے کا اہتمام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں یہ نظر آ رہا ہے اور مجھے یہ اطمینان حاصل ہے کہ اس کام کا تسلسل ان شاء اللہ برقرار رہے گا۔ یہ بھی یقیناً اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ ورنہ بعض بڑی نامور ہستیاں ایسی ہو گزری ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگیوں میں بڑے بڑے کام کر کے دکھائے لیکن ان کے جانے کے بعد اس کام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ ایک آدمی منظر سے ہٹا اور کام ختم ہو گیا۔ تو میرے لئے یہ بات بڑے اطمینان کی ہے اور اس پر بھی میں جتنا اللہ کا شکر ادا کروں کم ہے اور میرے ساتھیوں کو بھی اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔ بالخصوص یہ جو بنیادی کام دعوت رجوع الی القرآن کا ہے اس کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ بحمد اللہ اب ایک نسلِ ثانی ایسی تیار ہو چکی ہے اور کم و بیش چالیس پچاس نوجوانوں پر مشتمل ایک ٹیم ایسی وجود میں آ چکی ہے جو درسِ قرآن کے اس تسلسل کو ان شاء اللہ برقرار رکھے گی جسکا میں نے کبھی ۶۵ء میں آغاز کیا تھا۔ مجھے اطمینان ہے کہ دروس قرآن کے حوالے سے قرآن کا انقلابی فکر اور اس کا صغریٰ کبریٰ ان کے

ذہن و فکر کی گرفت میں آچکا ہے' اس میں جو منطقی ترتیب (Logical Sequence) ہے اسے انہوں نے خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے اور وہ اب اس قابل ہیں کہ اسے بیان بھی کر سکیں ۔ ظاہر بات ہے کہ صلاحیتِ بیان میں نکھار تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور اس صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے ہی سے پیدا ہوگا۔ لیکن اصل شے بنیادی فکر اور اس کے طرز استدلال کا ذہن کی گرفت میں آنا ہے جو الحمد للہ انہیں حاصل ہے۔ اس کے بعد تو پھر اپنی اپنی محنت اور کوشش ہے۔ اس فکر قرآنی کو عام کرنے اور بیان کرنے میں جتنی محنت اور جس درجے پیہم کوشش ہو گی اسی نسبت سے ان کی صلاحیت نکھرے گی۔ چنانچہ گزشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر میرا کوئی درس قرآن نہیں ہوا بلکہ درس قرآن میرے نوجوان ساتھیوں نے دیا۔ اس سال بھی انہی نوجوان ساتھیوں نے سالانہ اجتماع میں قرآن حکیم کا درس دیا۔

ذیلی انجمنوں اور ان کے تحت اکیڈمیز کا قیام

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند اور لائق تشکر ہے کہ مرکزی انجمن کی کوکھ سے اب تک کئی منسلک اور ذیلی انجمنیں برآمد ہو چکی ہیں۔ اس سال ۲۰ر اپریل کو مرکزی انجمن کا جو اجلاس عام ہوا اس میں پہلی مرتبہ بہت سے حضرات کے سامنے یہ بات آئی ہوگی کہ پاکستان کے کئی شہروں میں مرکزی انجمن کے طرز پر منسلک انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا کہ ہمارے اس اجلاس عام میں ذیلی انجمنوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے اور انہوں نے بھی اپنے اپنے علاقے کی انجمن خدام القرآن کا مختصر تعارف کرایا اور خدمتِ قرآنی کے میدان میں اپنی پیش رفت کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر کیا۔ تو الحمد للہ کہ کئی ذیلی انجمنیں وجود میں آچکی ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انجمنوں کے زیر اہتمام اکیڈمیوں کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ قرآن اکیڈمی کراچی کی نہ صرف یہ کہ تعمیر ایک حد تک مکمل ہو چکی ہے بلکہ وہاں دینی تعلیم کے ایک سالہ کورس کی تدریس کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پہلی مرتبہ کسی کام کا شروع کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ایک بار محنت کرنے سے جب ایک **Pattern** اور عملی نمونہ سامنے آجاتا ہے تو اس کام کا کرنا مشکل

نہیں رہتا۔ اس اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تشکیل اور قرآن اکیڈمی کے قیام میں محنت بھی زیادہ صرف ہوئی اور وقت بھی بہت لگا۔ لاہور میں مسلسل پانچ چھ برس میں نے فکر قرآنی کی اشاعت کا کام تن تنہا کیا جس کے نتیجے میں بحمد اللہ ۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی۔ پھر مزید پانچ سال بعد قرآن اکیڈمی کی پہلی اینٹ رکھنے کی نوبت آئی۔ عمارت کی تعمیر بھی مرحلہ وار ہوئی۔ آغاز میں صرف دفاتر یا رہائشی بلاک کی تعمیر عمل میں آئی۔ پھر کئی برس بعد جا کر قرآن اکیڈمی میں دینی تعلیم کے دو سالہ کورس کا آغاز ہوا۔ تو یہ داستان برسوں پر محیط ہے اس لئے کہ یہ کام پہلی بار ہو رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ اس کام کا ایک ہیولیٰ اور ابتدائی خاکہ بن چکا ہے اور اس کے بہت سے مراحل طے ہو چکے ہیں تو قوی امید ہے کہ بقیہ جگہوں پر مرکزی انجمن کی نہج پر جو کام ہو رہے ہیں ان میں اتنا وقت نہیں لگے گا بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ انجمن کی تاسیس سے لے کر قرآن اکیڈمی کی تعمیر اور آغاز تدریس تک کے مراحل طے کئے جا سکیں گے۔ چنانچہ کراچی میں بحمد اللہ کام کی رفتار تیز ہے۔ اب ملتان میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے ایک اکیڈمی وجود میں آچکی ہے' اس سال رمضان میں وہاں میرا دورۂ ترجمۂ قرآن بھی ہوا ہے اور اب امید ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں وہاں قرآن کالج کا آغاز ہو جائے گا۔ فیصل آباد میں منسلک انجمن موجود ہے۔ وہاں اکیڈمی کے لئے بعض مخیر خواتین نے ایک خاصا وسیع قطعہ زمین ہمیں ہبہ کیا ہے اور اب وہاں بھی تعمیر کا کام شروع ہوا چاہتا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ اس سالانہ اجلاس عام کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ انشاء اللہ العزیز پشاور' رحیم یار خان' حیدر آباد اور اسلام آباد میں بھی بہت جلد ذیلی انجمنوں کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اسی سال کے دوران وہاں اکیڈمیز کا کام بھی شروع ہو جائے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیز !

دورۂ ترجمہ قرآن —— تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ اس سال ماہ رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام قریباً گیارہ بارہ جگہوں پر ہوا ہے۔ اس کے ضمن میں تو مجھے کبھی کبھی حفیظ کا وہ شعر یاد آتا ہے کہ ۔

کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے   یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

بغیر کسی عُجب کے محض امر واقعہ کے طور پر یہ بات عرض کی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا۔ نماز تراویح کے ساتھ بیان القرآن کا جب ہم نے آغاز کیا تو شروع میں تراویح کے اختتام پر یا کبھی بیچ بیچ میں پندرہ بیس منٹ یا آدھ گھنٹے کا بیان ہوتا تھا۔ اس کے بعد میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ احادیث مبارکہ میں تو رمضان المبارک کے دو گونہ پروگرام کا ذکر ملتا ہے۔ دن کا روزہ اور رات کا قیام قرآن حکیم کے ساتھ' یہ دونوں بالکل متوازی پروگرام ہیں۔ اس پہلو سے محض نماز تراویح ادا کرنے یا کچھ تھوڑے بہت ایک آدھ گھنٹے کے بیان سے تو رمضان المبارک کا حق ادا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پھر دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام شروع کیا اور یہ آٹھواں یا نواں موقع تھا کہ بحمد اللہ مجھے دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی سعادت حاصل ہوئی۔۔۔۔ اس سال یہ پروگرام پانچ جگہوں پر ہوا۔ ایک جگہ میں نے قرآن کا ترجمہ بیان کیا اور چار دیگر جگہوں پر میرے شاگردوں نے مکمل ترجمہ قرآن بیان کیا۔ مزید برآں دورانِ رمضان نماز تراویح کے ساتھ چار پانچ جگہوں پر ویڈیو کے ذریعے یہ پروگرام لوگوں نے دیکھا اور سنا۔ رجوع الی القرآن کی یہ لہر الحمد للہ بڑھ رہی ہے اور اس میں لوگوں کا قرآن سے شغف اور تعلق بڑھ رہا ہے۔ پوری رات قرآن حکیم اور اس کا مفہوم سننے سمجھنے میں جو لذت ہے اس کا اس سے پہلے لوگوں کو تجربہ نہیں تھا۔ ع چوں معاملہ نہ دارد سخن آشنا نہ باشد! جب تک باہم محبت کا رشتہ نہ ہو اس وقت تک گفتگو کے اندر بھی وہ لوچ اور مٹھاس پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں جب قرآن پاک سے تعارف ہو جائے اور اس سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو جائے تو معاملہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے' پھر پوری رات انسان قرآن پڑھنے پڑھانے یا سننے سنانے میں گزار دیتا ہے اور یہ چیز اس پر ہرگز گراں نہیں گزرتی!

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ الحمد للہ ہمارے اس کام میں پیش رفت ہو رہی ہے اور تین اعتبارات سے معاملہ بہت اطمینان بخش ہے۔ ایک یہ کہ گو ہمارے کام کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں رہی تاہم الحمد للہ' ثم الحمد للہ اس میں تسلسل اور تواتر موجود

ہے۔ طوفان کے مانند اٹھنے اور بگولے کی طرح رخصت ہو جانے کے مقابلے میں یہ سست رفتاری کہیں بہتر ہے اور "سج پکے سو میٹھا ہو" کے مصداق توقع ہے کہ اس سے ان شاء اللہ پائیدار نتائج پیدا ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہمارے اس کام کے بھی دو بڑے بڑے گوشے ہیں اور الحمد للہ کہ ان کے مابین توازن و اعتدال برقرار ہے۔ ایک گوشہ رجوع الی القرآن کی تحریک کا ہے۔ قرآن حکیم کے نور ہدایت کو پھیلانا اور اس کے انقلابی فکر کو عام کرنا اس کے پیش نظر ہے۔ اس نور کا اتمام اللہ تعالیٰ نے فرما دیا اور اسکی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا' اب ہمارا کام اس کا افشاء کرنا ہے۔ اسے چہار دانگ عالم تک پھیلانا اور ہر ممکن طریقے سے اس کا ابلاغ کرنا اب ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لئے جہاں عوامی سطح پر قرآن کے ذریعے وعظ و نصیحت کا کام ضروری ہے وہاں دانشوروں کے لئے اور Intellectuals کے لئے ان کی علمی سطح کے مطابق اس کا ابلاغ بھی اسی قدر ضروری اور لازمی ہے ---- دوسرا گوشہ اقامت دین کی جدوجہد کا ہے کہ قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا محض ایک مشغلہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس تعلیم و تعلّم قرآن کے ساتھ ساتھ اس کا دوسرا پہیہ بھی متوازی چلنا چاہئے۔ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد اور اس کے لئے تنظیم اور تحریک کا کام بھی متوازن انداز میں آگے بڑھنا چاہئے۔ الحمد للہ کہ یہ دونوں کام بہت حد تک متوازن انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

اور تیسری بات یہ کہ آئندہ کے تسلسل کے بارے میں بھی مجھے اطمینان ہے کہ یہ کام ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا اور ویسے بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اب عمر کے جس حصے میں ہوں اس کے بعد تو "نافلۃً لک" کا درجہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ۲۶ اپریل کو میری عمر کے ساٹھ برس مکمل ہو رہے ہیں اور مسنون عمر تو کل ۶۱ برس یا ساڑھے ساٹھ برس ہی بنتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۶۳ برس قمری حساب سے تھی' شمسی حساب سے یہ قریباً ۶۱ برس بنتے ہیں۔ میری اس بات کو غلط مفہوم میں نہ لیا جائے کہ معاذ اللہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی کوئی مشابہت ثابت کرنا چاہتا ہوں بلکہ میں دیانۃً یہ سمجھتا ہوں اور اکثر اپنے ان قریبی ساتھیوں سے یہ بات کہتا ہوں جو اس عمر کو پہنچے ہوئے ہوں کہ ساٹھ اکسٹھ برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھنا

چاہئے کہ مسنون عمر تو پوری ہوئی اب بقیہ زندگی بونس ہے۔ یہ "نافلۃً لک" کے درجے کی چیز ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین کی خدمت کے لئے صرف ہونا چاہئے۔

ہماری تحریک اور شجرۂ طیبہ کی مثال

اس ضمن میں ایک اور نکتہ اشارۃً عرض کئے دیتا ہوں اور اس میں بھی میرے لئے اطمینان کا بہت کچھ سامان مضمر ہے۔ سورۃ ابراہیم میں ایک پاکیزہ درخت کی جو مثال آئی ہے' وہ ہمارے اس کام پر بحمد اللہ بہت حد تک صادق آتی ہے: "**اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ**"۔۔ کسی بھی شجرۂ طیبہ یعنی پاکیزہ درخت کی یہ مثال ہے کہ اس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ زمین میں قائم ہو اور اسکی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ الحمد للہ کہ ہمارے کام کی بھی یہی شان ہے۔دعوت رجوع الی القرآن کا کام اس پوری تحریک کی جڑ کے مانند ہے جو مضبوطی کے ساتھ زمین میں پیوست ہے۔ اس میں ہماری صلاحیتیں اور ہمارے وسائل بھرپور طور پر صرف ہو رہے ہیں۔ تنظیم اسلامی اس شجرہ طیبہ کے تنے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے برگ و بار اور اسکی شاخوں کا مقام تحریکِ خلافت کو حاصل ہے۔ اللہ کو اگر منظور ہوا تو یہ کام ضرور آگے بڑھے گا۔

میں نے اپنا یہ تجزیہ کئی مواقع پر آپ کے سامنے رکھا ہے کہ پاکستان کے استحکام اور اس کے بقا کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہی ہے کہ یہاں وہ صحیح اور مکمل اسلامی نظام قائم ہو جس کا عنوان ہے نظامِ خلافت۔ اگر پاکستان اور اہل پاکستان کے لئے اللہ نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا ہے تو قوی امید ہے کہ یہ تحریک آگے بڑھے گی اور سرزمین پاکستان پر نظام خلافت کا قیام و نفاذ ہوگا۔ اس لئے کہ پوری دنیا کے اوپر اسلام کا جو غلبہ ہونا ہے جس کی صریح پیشین گوئیاں حضورؐ کی احادیث میں موجود ہیں' ظاہر بات ہے کہ کسی ایک خطۂ زمین ہی سے اس عمل کا آغاز ہوگا' اور اگر اللہ کی مشیت میں یہ ہے کہ اس عمل (Process) کا نقطۂ آغاز سرزمینِ پاکستان بنے تو یقیناً غلبہ و اقامتِ دین کی یہ جدوجہد آگے بڑھے گی اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کریں گی۔ ہاں ہم میں سے ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ اس جدوجہد میں اس کا ذاتی حصہ

(Contribution) کتنا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے ہاں تو حساب کتاب انفرادی بنیادوں پر ہوگا: "وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا"۔ وہاں تو ہر شخص انفرادی حیثیت میں پیش ہوگا۔ ہر شخص کو اس کا اعمالنامہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا اور حکم ہوگا کہ: "اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا"۔ یہ تمہاری بیلنس شیٹ موجود ہے' اسے پڑھو اور آج اپنے حساب کے لئے تم خود ہی کافی ہو۔ تو ہم میں سے ہر شخص کو اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ دین کی جانب سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ انہیں ادا کر رہا ہے یا نہیں!

قرآن حکیم کی بے مثال تاثیر اور قوت تسخیر

اب تک جو باتیں میں نے عرض کی ہیں اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر بالخصوص ماہِ رمضان مبارک کے دوران جو مختلف اجتماعات ہوئے ان میں بیان کی ہیں۔ آج میں ایک اور اہم بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے حالیہ سالانہ اجتماع کے موقع پر میں بطورِ تحفہ شرکاءِ اجتماع کے سامنے رکھنا چاہتا تھا لیکن چونکہ وہاں ذیلی انجمنوں کے نمائندگان کی تقاریر زیادہ طویل ہو گئیں تو وقت کی کمی کے پیش نظر میں نے اپنی اس گفتگو کو ملتوی کر دیا۔ چنانچہ وہ تحفہ میں آپ کی خدمت میں اب پیش کر رہا ہوں اور وہ ہے قرآن مجید کی قوتِ تسخیر اور اس پر اعتماد اور توکل سے متعلق۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ بندۂ مومن کے لئے اصل سہارا اللہ کی ذات ہے اور جہاں کوئی ظاہری اور مادی سہارا موجود نہ ہو اور بظاہر ہر طرف سے مایوسی نظر آتی ہو' ایک بندۂ مومن اللہ ہی پر توکل کرتا ہے اور اس کی رحمت کی آس لگائے رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں جابجا اس حقیقت کو بیان کیا گیا: "وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" کہ اہلِ ایمان کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔ لیکن میں آج جان بوجھ کر قرآن حکیم پر اعتماد اور توکل کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں تاکہ لوگ چونکیں' ان کے ذہنوں میں سوال اٹھے اور وہ توجہ سے اس بات کو سنیں کہ قرآن کی قوتِ تسخیر اور اس پر توکل و اعتماد کے بارے میں وہ کیا بشارتیں ہیں کہ جو خود قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں۔

قرآن حکیم کی شان

شاید کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئے کہ توکل کے لفظ کا قرآن حکیم کے ساتھ اس طور پر استعمال کچھ غیر مناسب ہے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اس بات کو پوری وضاحت سے بیان کروں۔ دیکھئے' قرآن مجید ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ جو تاثیر تجلیٔ ذاتِ باری تعالیٰ کی ہے وہی تاثیر قرآن مجید کی بھی ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں درخواست کی کہ **"رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ"** کہ اے پروردگار میں تجھے بچشمِ سر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات سمجھانے کی غرض سے کہ وہ تجلیٔ ذاتِ حق کا تحمل نہ کر پائیں گے' اپنی ایک تجلی پہاڑ پر ڈالی۔ قرآن حکیم نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: **"فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا"** کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی تجلیٔ ذات کے بالواسطہ مشاہدے کا تحمل بھی نہ کر سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہی بات قرآن مجید کی عظمت کے بارے میں ایک تمثیل کے پیرائے میں سورۃ الحشر میں آئی ہے: **"لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ"** کہ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے۔ تو درحقیقت جو تاثیر تجلیٔ باری تعالیٰ کی ہے وہی ہیبت اور وہی دبدبہ کلامِ باری تعالیٰ کا ہے۔ ان دونوں میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اس حقیقت کو بھی علامہ اقبال نے خوب سمجھا اور بڑی خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ میرے علم کی حد تک اس دور میں اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس کے ذہن کی رسائی یہاں تک ہوئی ہو۔ فرماتے ہیں:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں

کہ میں تم سے صاف ہی کہہ دوں جو کچھ میرے دل میں ہے۔ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہے۔ اسے عام معنوں میں کتاب نہ سمجھو یہ "چیزِ دگر" ہے۔ یعنی جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی' اسی طرح یہ کتاب بھی بیک وقت ان دونوں متضاد صفات

کی حامل ہے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الحی اور القیوم ہے اسی طرح اس کا کلام بھی زندہ و پائندہ ہے۔ قرآن حکیم کے لئے "کتابِ زندہ" کے الفاظ تو اقبال نے اور بھی کئی مقامات پر استعمال کئے ہیں۔

ایں کتاب زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُولا یزال است وقدیم

بہرحال' حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی قوتِ تسخیر کے بارے میں ہم نے بڑی ناقدری کا معاملہ کیا ہے۔ ہمیں نہ تو قرآن حکیم کی عظمت کا ادراک حاصل ہے اور نہ اس کی قوتِ تسخیر پر اعتماد۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت اور کیسی عظیم قوت ہے جو اللہ نے قرآن حکیم کی صورت میں ہمیں عطا فرمائی ہے۔

دو آیات ـــــ دو عظیم بشارتیں

اسی ضمن میں سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی دو آیات کے حوالے سے بھی میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی آیت تو حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے لیکن دوسری آیت "مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی" میں ایک عظیم حقیقت کا بیان ہے۔ یہاں خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اے نبی' ہم نے آپ پر یہ قرآن اسلئے نازل نہیں کیا کہ آپ ناکام ہوں یا بے مراد ہوں ـــــ یہاں ایک تھوڑی سی تفسیری وضاحت ضروری ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ اے نبی' یہ قرآن ہم نے اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔ لفظ "تشقٰی" کا مادہ "ش ق ی" ہے جس سے شقی کا لفظ بنا ہے۔ یہ لفظ "سعید" کے مقابلے میں آتا ہے۔ تو شقی اس کو کہتے ہیں جو بد بخت ہو' ناکام ہو' بے مراد ہو۔ یعنی وہ شخص جس کی جدوجہد لاحاصل رہے' نتیجہ خیز نہ ہو رہی ہو' وہ شقی ہے۔ جبکہ مشقت کا لفظ "ش ق ق" کے مادے سے بنتا ہے۔ یہ دونوں مادے چونکہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اسی قرب کے باعث ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں' شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے "لِتَشْقٰی" کا ترجمہ مشقت سے کیا ہے۔ تاہم مجھے ان سے اختلاف ہے۔ یہاں درحقیقت یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل نہیں ہوا کہ آپ ناکام ہوں۔ یہ تو ضمانت ہے کامیابی کی۔ اس قرآن میں جو

قوتِ تسخیر اور جو تاثیر مضمر ہے اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سب کے ہوتے ہوئے آپ ناکامی سے دوچار ہو جائیں۔ آپؐ یقیناً کامیاب ہونگے اور منزل مراد تک پہنچیں گے۔ اس دنیا میں بھی آپ کی جدوجہد کامیابی سے ہم کنار ہوگی اور آخرت میں بھی آپ کے مراتب بلند سے بلند تر ہونگے۔ شقاوت آپ کے حصے میں نہیں آسکتی' نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔ یہ قرآن آپ کی کامیابی کی ضمانت ہے' یہ شقاوت کی ہر اعتبار سے نفی کرنے والا ہے۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس میں ہر اس شخص کے لئے جو قرآن مجید کی کسی بھی درجے میں خدمت کر رہا ہو' کس قدر بشارت ہے اور اس کی دلجوئی کا کتنا کچھ سامان اس میں مضمر ہے۔ **مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی**۔ اس قرآن کی شمشیر کو ہاتھ میں لو' اس کے حقوق کو ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاؤ' تم خود اپنی آنکھوں سے اس کی قوت تسخیر کا مشاہدہ کروگے۔ اس کے اندر جو ہیبت پنہاں ہے اور اس میں جو بے پناہ تاثیر پوشیدہ ہے' قدم قدم پر اس کے مظاہر تمہارے سامنے آئیں گے اور تم بچشم سر ان کا مشاہدہ کر سکو گے۔

اس ضمن میں تیسری آیت جس کا میں حوالہ دینا چاہتا ہوں' سورۃ القصص کے آخری حصے میں وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ تفسیری اعتبار سے اس آیت کے مفہوم کی تعیین میں بھی کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ فرمایا: **"اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ"** کہ اے نبی' جس ہستی نے آپ پر یہ قرآن لازم کیا ہے' اس قرآن کی تبلیغ اور اس کے ابلاغ کا فرض جس نے آپ پر عائد کیا ہے' وہ آپ کو لازماً لوٹائے گا ایک بہت بلند اور اعلیٰ لوٹنے کی جگہ کی جانب ---- بعض حضرات نے یہاں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "معاد" سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اس آیت کا تعلق آپؐ کے سفر ہجرت سے ہے کہ جب آپؐ ہجرت کیلئے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو مشرکینِ مکہ کے تعاقب سے بچنے کے لئے کچھ دور تک آپ نے عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک مشکل راستہ اختیار کیا تھا اس لئے کہ عام شاہراہ پر اگر آپؐ سفر کرتے تو تعاقب کرنے والوں کی نگاہ میں آجاتے۔ تو آپ نے وہ پہاڑی راستہ اختیار کیا جو بالکل غیر مستعمل اور غیر مانوس تھا۔ لیکن تقریباً ایک تہائی سفر طے کرنے کے بعد آپؐ پھر آگئے اسی شاہراہ پر کہ جو مکہ سے مدینے کی طرف جاتی تھی۔ جب آپؐ وہاں پہنچے تو چونکہ وہاں آپ کے لئے ایک دوراہے

کی صورت بن گئی تھی کہ ایک راستہ مکے کو جاتا تھا اور دوسرا مدینے کی جانب' تو دل میں ہوک سی اٹھی' گویا کہ مکہ نے پھر اپنی طرف کھینچا' بیت اللہ سے اور حرمِ مکی سے جو محبت محمدؐ رسول اللہؐ کو تھی' اس نے آپؐ کو وقتی طور پر بے چین کیا' اس وقت دلجوئی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی: "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ" کہ اے نبی' آپ گھبرائیے نہیں' مکہ اور بیت اللہ سے آپ کی یہ جدائی عارضی ہوگی' ہجر کا یہ معاملہ مستقل نہیں رہے گا' یقیناً وہ رب جس نے آپ پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اسکی دعوت کا فریضہ عائد کیا ہے وہ آپ کو لوٹا کرلے جائے گا لوٹنے کی جگہ یعنی مکہ مکرمہ!

میرے نزدیک یہ بات اپنی جگہ ایک لطیف خیال کے درجے میں تو صحیح ہے لیکن یہ کہ اگر سورۃ القصص کے زمانہ نزول کو دیکھا جائے اور بعض دیگر قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو اس آیت کی یہ تاویل مطابق واقعہ معلوم نہیں ہوتی۔ سورۃ القصص اپنے مضامین اور اسلوب کے اعتبار سے ان سورتوں میں شمار ہوتی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کے درمیانی عرصے میں نازل ہوئیں۔ پھر یہ کہ یہ بات بھی بڑی قابل لحاظ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی حضورؐ نے دوبارہ مکہ میں قیام اختیار نہیں فرمایا۔ حالانکہ فتح مکہ کے بعد اگر آپ چاہتے تو وہیں قیام فرماتے' مدینہ مراجعت اختیار نہ فرماتے۔ اس اعتبار سے بھی وہ تاویل خلاف واقعہ بنتی ہے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ "معاد" سے مراد ہے آپ کا مقام' آپ کے لوٹنے کی جگہ 'اعلیٰ انجام۔ جیسے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں بشارت کے طور پر فرمایا گیا : "عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا" کہ آپؐ کو تو آپ کا رب مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص قرآن کی دعوت و تبلیغ میں لگا ہوا ہو' لوگوں کو قرآن حکیم کی طرف بلانے میں وہ رات دن ایک کررہا ہو اور پھر وہ ناکام ہوجائے! نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ"۔ اے نبی' یقیناً ایک بہت اعلیٰ انجام سے آپ دو چار ہوں گے' آپ کی جدوجہد کا ایک بہت اعلیٰ نتیجہ نکلے گا جس سے کہ آپ ہم کنار ہونگے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں آیات قرآن مجید کے بارے میں بڑی عظیم بشارتوں پر مشتمل ہیں۔

میری زندگی کے دو عجیب واقعات

اس دوسری آیت کے بارے میں جب میں سوچ رہا تھا تو مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ بلکہ چونکہ آج دو چیزوں کا تذکرہ چل رہا ہے یعنی مرکزی انجمن اور تنظیم اسلامی تو اس مناسبت سے دو ہی واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان دونوں کا تعلق ۷۲ء سے ۷۵ء تک کے عرصے سے ہے جب مرکزی انجمن قائم ہوئی اور تنظیم اسلامی کے قیام کے لئے میدان ہموار ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک واقعہ در اصل ایک خواب ہے جس کا تذکرہ میں کچھ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے کر رہا ہوں کہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کریں کہ اب یہ بھی خوابوں کی دنیا میں آگیا۔ میں جس خواب کا ذکر کر رہا ہوں وہ آج سے بیس برس پہلے کا ہے اور اس سے قبل بعض قریبی احباب کو میں نے سنایا بھی ہے۔ جس زمانے میں میں تنظیم اسلامی کے قیام کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا اور تقریباً اس کے قیام کا فیصلہ کر چکا تھا میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں مرگیا ہوں اور میں اپنے جنازے کا منظر بھی ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے خود کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنی موت کے تمام مراحل کا یہاں تک کہ قبر میں اتارے جانے کا بھی خود مشاہدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا کہ میری نگاہوں کے سامنے مجھے قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ میں نے اسی وقت بعض بزرگوں سے اس خواب کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک بہت بڑی بشارت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہاری زندگی کا ایک دور ختم ہوگیا ہے اور دوسرا دور اب شروع ہوا چاہتا ہے۔ ایک عزم مصمم کے ساتھ اقامت دین کی تحریک کے از سر نو آغاز کرنے کا جو ارادہ کر لیا ہے یہ درحقیقت اس بات کے مترادف ہے کہ ایک زندگی ختم ہوئی اور ایک بالکل نیا دور اب شروع ہو رہا ہے۔ (واللہ اعلم)

دوسرا واقعہ بھی میری ایک ایسی کیفیت سے متعلق ہے جو بیداری اور نیند کے بین بین تھی۔ واقعے کے سرور اور لذت کا ابھی تک مجھے احساس ہوتا ہے۔ یہ خواب نہیں تھا بلکہ ایک خاص کیفیت تھی جو نیم غنودگی کی حالت میں مجھ پر طاری ہوئی۔ کچھ "بَیْنَ النَّوْمِ وَ الْیَقْظَۃِ" کا سا معاملہ تھا۔ نیند اور بیداری کے مابین ایک کیفیت میں میں محسوس کرتا ہوں کہ لگاتار ایک آواز میرے کان میں آرہی ہے۔ کوئی مسلسل مجھے یہ الفاظ قرآنی سنا رہا

ہے کہ: "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ" اس کے بعد جب میں پوری طرح بیدار ہوا تو ایک عجیب سرور، انبساط اور انشراح کی کیفیت جن کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، متعدد کئی روز تک بلکہ کافی عرصے تک مجھ پر طاری رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت مجھے تلاش کرنا پڑا تھا کہ یہ آیت قرآن حکیم کے کس حصے اور کس سورۃ میں ہے۔ اس لئے کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا باضابطہ مطالعہ تو اگرچہ بحمد اللہ زمانہ طالب علمی سے جاری ہے لیکن زیادہ تفصیلی غور و فکر کا اصل موقع مجھے اپنے سلسلہ وار درس قرآن حکیم کے ساتھ ملا، بالخصوص تفسیری اختلافات اور مختلف آراء کے مابین اپنی آخری رائے میں نے زیادہ تر اپنے مسلسل درس کے دوران ہی قائم کی ہے۔ اور اُس وقت جبکہ میں اس دلفریب تجربے سے گزرا میرا درس، قرآن حکیم کے اِس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اگر تو ایسا ہوتا کہ سورۃ القصص انہی دنوں میرے زیر درس آئی ہوتی اور اس وجہ سے میرے ذہن پر یہ کیفیت طاری ہوتی تو شاید میں اس کی کوئی دوسری تاویل کرتا۔ لیکن چونکہ یہ بات نہیں تھی لہٰذا اسے میں نے اپنے حق میں بہت بڑی بشارت سمجھا، سرور وانبساط کی کیفیت دیر تک مجھ پر طاری رہی اور "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ" کی مٹھاس اور حلاوت کا تاثر ایک عرصے میرے قلب و ذہن کو فرحت بخشتا رہا۔

ذہن و قلب پر قرآن حکیم کا تسلط اور اس کے مظاہر

قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر کے ضمن میں ایک اصطلاح میں استعمال کیا کرتا ہوں کہ قرآن اپنے طالب کو Possess کر لیتا ہے، اس کے ذہن و قلب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ میرے بعض ساتھی یہی لفظ میرے لئے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ میں اگر اس کیفیت سے نکلنا یا نکلنے کی غرض سے ہلنا بھی چاہوں تو ہل نہیں سکتا۔ اسلئے کہ جس طریقے سے میں اللہ کے فضل و کرم سے اس کام میں لگا ہوں اس طور سے کام اپنے کسی ارادے اور منصوبے کے تحت نہیں ہوا کرتے۔ ایسی کیفیت تو اسی شخص کی ہو سکتی ہے جو کسی عظیم قوتِ تسخیر کے زیر اثر کسی شکنجے میں آگیا ہو، جکڑا گیا ہو۔ حالانکہ ایسا بھی ہوا کہ کئی کام جو میں نے بالارادہ شروع کئے، کوشش کے

باوجود میں انہیں مکمل نہیں کرسکا۔ مثلاً ایک موقع پر میں نے اپنے ذاتی حالات لکھنے شروع کئے لیکن وہ سلسلہ بیچ ہی میں کہیں رک گیا۔ خدمتِ قرآنی کا کام بھی اگر میں محض اپنے ارادے کے تحت کرتا تو اس طور سے ہرگز نہ کرپاتا جیسا کہ اللہ نے مجھ سے کروایا ہے۔ اللہ کی تائید و توفیق قدم قدم پر میرے شامل حال رہی۔ میں نے جب اپنی میڈیکل پریکٹس بند کی تو کوئی ذریعۂ معاش میرے پاس تھا نہ کوئی جائیداد میرے پاس موجود تھی۔ لیکن یہ کہ توفیق الٰہی سے یہ طے کرلیا تھا کہ اب جسم و جان میں جو بھی توانائی اور رمق باقی ہے وہ اسی کام میں لگے گی۔ میرے پاس کرشن نگر میں اپنی رہائش کے لئے بس ایک مکان تھا (جسے بعد میں بیچ کر اکیڈمی کے سامنے مکان بنوایا) اس کے سوا اور کوئی جائیداد میرے پاس موجود نہیں تھی لیکن یہ کہ اللہ نے ہمت دی اور میں نے طے کرلیا کہ آئندہ زندگی کا کوئی لمحہ اب تلاشِ معاش میں صرف نہیں ہوگا' سارا وقت اور صلاحیتیں معاد کے حصول میں صرف ہوں گی۔ ظاہربات ہے کہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ میرے پاس اگر وسائل ہوتے' جاگیریں ہوتیں اور ان کے بل پر میں یہ فیصلہ کرتا تو معاملہ مختلف ہوتا۔ الحمدللہ میرے چار بھائی ہیں اور بعض نے مختلف مواقع پر مجھ سے تعاون بھی کیا ہے لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اُس وقت سب بھائیوں کے ساتھ میرے تعلقات کشیدہ تھے۔ چنانچہ اپنے کسی بھائی کا تعاون مجھے اس وقت حاصل نہیں تھا۔ بڑے بھائی کے ساتھ تو بعد میں بھی اسطرح کے حالات نہیں رہے کہ ان کی جانب سے تعاون کا معاملہ ہوتا' چھوٹے بھائی اقتدار احمد نے البتہ تعاون کیا لیکن اس کی نوبت بہت بعد میں آئی۔ انہوں نے بعد میں ایک موقع پر جب مجھے یہ آفر کی کہ میں آپ کے کام میں شریک ہونا چاہتا اور آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں تو پہلی بات میں نے ان سے یہ کہی اگر تو صرف بھائی ہونے کے ناطے سے تعاون کرنا چاہتے ہو تو مجھے قبول نہیں ' ہاں اگر تمہیں میرے اس مشن کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے اور اس میں تعاون کرنا چاہتے ہو تو سر آنکھوں پر۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن کی قوت تسخیر ہی کا اثر تھا کہ کسی قسم کے معاشی وسائل نہ رکھتے ہوئے بھی اور کسی دنیاوی سہارے کے موجود نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی میڈیکل پریکٹس کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرلیا اور دعوت رجوع الی القرآن کے کام میں ہمہ وقت مشغول ہوگیا۔ اسے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ہی نے مجھے Possess کرلیا تھا اور

میرے ذہن و قلب کو پورے طور پر اپنی گرفت میں لے لیا تھا!

رسول اور کتاب---ایک حیاتیاتی وحدت

اسی ضمن میں ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں' اگرچہ یہ ایک نازک سا مسئلہ ہے۔ میرے درس قرآن سننے والے اکثر حضرات کے علم میں ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مضمون یہ بھی ہے کہ "رسول" اور "کتاب" دونوں مل کر ایک حیاتیاتی اکائی (Organic Whole) کی مانند ایک وحدت بنتے ہیں۔ اور دنیا میں جو بھی خیر وجود میں آتا ہے اور جو بھی انفرادی یا اجتماعی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ درحقیقت ان دونوں کی مشترک تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اب میں قرآن حکیم کے ان دو مقامات کا حوالہ دوں گا جہاں رسول اور کتاب کو ایک وحدت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البینہ میں فرمایا گیا:

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ○

"نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا مشرکین میں سے اور اہل کتاب میں سے باز آنے والے جب تک کہ ان کے پاس 'بیّنہ' (یعنی واضح دلیل) نہ آجاتی۔"

اگلی آیت "بینہ" کی وضاحت پر مشتمل ہے:

رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ○ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ○

"(یعنی) ایک رسول اللہ کی طرف سے پڑھتا ہوا (اللہ کے) پاکیزہ صحیفوں کو جن میں محکم کتابیں ہیں"۔

گویا کہ "رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ" اور "صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" یہ دونوں مل کر "بیّنہ" بنتے ہیں۔

اس کی دوسری مثال سورۃ الطلاق میں ہے' جہاں فرمایا گیا:

قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ○ رَّسُولًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ

"ہم نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کردیا ہے(یعنی) ایک رسول جو تمہیں پڑھ کر سناتا ہے اللہ کی واضح آیات تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کریں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے!"

تو معلوم ہوا کہ "ذکر" بھی رسول اور کتاب کا دونوں کا مرکب ہے اور "بینہ" بھی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دو اجزاء پر مشتمل کسی مرکب کے ایک جزء کو اگر آپ زیادہ اہمیت دے دیں گے تو دوسرے جزء کی اہمیت اسی نسبت سے کم ہو جائے گی۔ اگر آپ ایک جزء کو زیادہ Emphasize کردیں گے تو اس کا منطقی نتیجہ نکلے گا کہ دوسرا جز پس منظر میں چلا جائے گا اور ان دونوں اجزاء کی جو مشترک تاثیر ہے وہ برقرار نہیں رہے گی۔ یہی حادثہ اس امت کے اندر بھی پیش آیا اور "رسول" اور "کتاب" پر مشتمل مرکب کے دونوں اجزاء کی اہمیت میں دو اعتبارات سے کمی بیشی کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک انتہا پر منکرین حدیث اور منکرین سنت ہیں جو رسول کی اہمیت کم کردیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل شے کتاب ہی ہے اور رسول کی حیثیت گویا محض ڈاک کے ہرکارے کی ہے۔ جیسے چٹھی رسان کا کام چٹھی پہنچانا ہوتا ہے جو اصل اہمیت کی حامل ہوتی ہے' اسی طرح رسول کا کام اللہ کا پیغام پہنچادینا ہے سو وہ اس نے پہنچادیا۔ اب اصل شے یہ قرآن ہے' لہٰذا اصل اہمیت اسی کی ہے۔ یہ بات بظاہر بڑی دل کو لگتی ہے' لیکن یہ درحقیقت "کلمۃٌ حقٌ اُرید بہا الباطل" والا معاملہ ہے' یعنی بات تو درست ہے' لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا جانا مقصود ہے وہ باطل ہے۔ اس لئے کہ اس طرح نبیؐ کی ذات کی نفی کی جارہی ہے' ان کی سنت کی حجیت کا انکار کیا جارہا ہے' اور قرآن کی جو تشریح و توضیح آپؐ نے اپنے قول و عمل سے فرمائی ہے اس کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی اسی درجے انتہا پسندانہ ہے۔ یہ بات ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ جو مرکب ہے رسول اور قرآن کا' عام مسلمانوں نے اس میں سے رسول کی ذات کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ دوسرے جزء یعنی قرآن کی اہمیت کی نفی ہوگئی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ جو بھی تربیتی' اصلاحی اور انقلابی کام ہوا وہ رسولؐ کی صحبت سے ہوا۔ اس تاثر سے قرآن کی تاثیر کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ بات ذرا باریک بھی ہے اور نازک اور حساس بھی' لیکن میں چاہتا

ہوں کہ ان حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سے ایک عام مسلمان کو یہ مغالطہ لاحق ہو سکتا ہے کہ شاید اس طرح حضورؐ کی توہین کی جارہی ہے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ' لیکن دراصل اس معاملے میں توازن کی ضرورت ہے۔

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار!

عوامی سطح پر ہمارے جو دینی تصورات ہیں ان میں عمل سے فرار کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ نبی کو اتنا اونچا کرو' اتنا اونچا کرو کہ خدا کے برابر بٹھا دو۔ تو جب خدا کے برابر بٹھا دوگے تو اب اتّباع کا سوال ہی نہیں ہے۔ اب تو حمد ہی ہو سکتی ہے' تعریف ہی ہو سکتی ہے' آپؐ کی شان میں نعت کہی جا سکتی ہے' لیکن آپؐ کا اتباع تو نہیں ہو سکتا۔ اتباع تو کسی انسان ہی کا ہو سکتا ہے' کسی معبود کا تو نہیں ہو سکتا۔ آپ اللہ کا اتباع نہیں کر سکتے۔ اللہ کی اطاعت کریں گے' اللہ کی عبادت کریں گے' اتباع تو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ جو کیا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنا دیا گیا یہ بھی درحقیقت انسان کی وہی چالاکی ہے کہ اگر ہم نے انہیں انسان کی سطح پر رکھا پھر تو ان کی پیروی لازم ہو جائے گی۔ اگر وہ انسان ہی تھے پھر تو ان کا اتباع ضروری ہے پھر تو ان کے نقش قدم پر چلنا لازم ہوگا۔ لہٰذا انہیں اٹھاؤ اور اٹھا کر معبودوں کی فہرست میں شامل کر دو۔ اسے کہتے ہیں "دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار!" چنانچہ یہ یوں ہی نہیں ہوا ہے کہ بس نعتیں پڑھ لیں تو حضورؐ کا حق ادا ہوگیا۔ باقی کہاں ہم' کہاں حضورؐ کا مقام۔ ہم سے آپؐ کا اتباع کیسے ممکن ہے؟ یہ کہا اور فارغ ہوئے ع عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

قرآن سے بے اعتنائی کی مختلف وجوہات

اس کے علاوہ متعدد دیگر عوامل ہیں جو قرآن کریم کی اہمیت کو کم کرنے اور اسے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کا سبب بنے ہیں۔ اور یہ ایک منظم سازش کے تحت کیا گیا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ہمارے پرچے میں شائع بھی ہوا تھا' اس میں انہوں نے دلائل سے یہ بات ثابت کی تھی کہ یہ معاملہ از خود نہیں ہوا بلکہ قرآن کو منظر سے ہٹانے کی اور اس کی تعلیمات کو

مسلمانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی دانستہ کوششیں کی گئیں۔ عوام الناس پر ظلم ڈھانے والے اور ان کے حقوق غصب کر کے خود عیاشیاں کرنے والے سلاطین و ملوک اور جاگیردار و سرمایہ دار نہیں چاہتے تھے کہ قرآن کا انقلابی فکر لوگوں کے سامنے آئے۔ ع "چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب!" انہیں اندازہ تھا کہ اگر یہ کتاب اور اسکی روشن تعلیمات لوگوں کی نگاہوں میں آگئیں تو ہم ننگے ہو جائیں گے' لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور ہمارے استحصالی نظام کے بخیے ادھڑ جائیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے بند رکھو' اسے صرف حصولِ ثواب کا ذریعہ بنادو' گاہے بگاہے ختمِ قرآن یا ایصالِ ثواب کی محفلیں منعقد کرلی جائیں' کچھ کھانے پینے کا سلسلہ ہو جائے' اللہ اللہ اور خیر سلاّ! تو یہ سب کچھ در حقیقت ایک سازش کے تحت ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک معاملہ یہ بھی ہوا کہ جب تاثیرِ قرآن کی طرف سے توجہ ہٹ گئی اور ایمان کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ یعنی تاثیرِ صحبتِ محمدیؐ ذہنوں میں باقی رہ گیا تو یہ مسئلہ کھڑا ہو کہ صحبتِ محمدیؐ تو ہمیں حاصل نہیں ہے' اب کیا کیا جائے!۔۔۔ چنانچہ اس کی تلافی کے لئے یہ مراقبے' یہ سارے اوراد و اشغال اور یہ تپسیائیں اور ریاضتیں' غرضیکہ ایک لمبا چوڑا طومار وجود میں لایا گیا۔ یہ سب کچھ محض اس دلیل پر ہوا کہ جو اصل عامل تھا یعنی تاثیرِ صحبتِ نبویؐ" وہ تو ہمیں حاصل نہیں ہے لہٰذا اسکا کوئی نہ کوئی بدل ہونا چاہئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اشغال اور ریاضتیں اور یہ چالیس چالیس برس کی بادیہ پیمائی اور نفس کشی کے یہ مختلف انداز' یہ سب چیزیں ہمارے عوام میں اعلیٰ اقدار شمار ہونے لگیں۔ لوگوں کی دینداری کو اسی پیمانے سے ناپا جانے لگا اور اس چیز نے ہمارے دینی فکر کو اس کے اصل مرکز و محور یعنی قرآن حکیم سے ہٹادیا۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے رسول اور کتاب کے مرکب میں سے کتاب کی قوت تاثیر کو منہا کردیا۔ یہ ہم سب کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اصل فیصلہ کن شے قرآن ہے!

اب آیئے اس سلسلے کی تیسری آیت کی طرف جو سورۃ بنی اسرائیل کے آخری حصے

میں وارد ہوئی ہے:

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝

"اے نبی ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق کے ساتھ ہی نازل ہوا ہے اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔"

یہاں بھی آپ دیکھئے کہ قرآن حکیم اور نبی اکرمؐ دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ بالخصوص قرآن حکیم کا ذکر جس زور دار اور فیصلہ کن انداز میں یہاں آیا ہے وہ بہت قابل توجہ ہے۔ قرآن حکیم کے لئے "بالحق" کی تکرار اسکی غیر معمولی اہمیت و عظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس حوالے سے اسی نکتے کی جانب میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصل فیصلہ کن شے یہ قرآن ہے۔ چنانچہ یہی وہ شے ہے جس کے لئے بقا اور دوام ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن حکیم میں ایک مقام پر یہ الفاظ بھی آئے ہیں: "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" کہ اے نبی آپ کا بھی انتقال ہو جائے گا اور یہ لوگ بھی مرجائیں گے۔ لیکن نوع انسانی کا تسلسل تو قیامت تک باقی ہے' ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اصل شے کونسی شے ہے؟ یہی قرآن' جس کو بقا اور دوام حاصل ہے۔ اصل قوتِ تسخیر اس قرآن میں ہے۔ یہ قرآن لوگوں کو Possess کرے گا' ان کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر ان کے باطن میں انقلاب برپا کرے گا۔ جو اس قرآن کی راہنمائی سے فائدہ اٹھائیں ان کے لئے بشارتیں بھی اسی قرآن میں موجود ہیں۔ اور جو اس سرچشمۂ ہدایت کو رد کردیں ان کے لئے تنبیہہ اور وارننگ ہے کہ ایک دردناک عذاب ان کا منتظر ہے:

"اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا"

حاصل کلام یہ ہے کہ اصل تاثیر اور قوت تسخیر اس قرآن میں ہے جس کے لئے الفاظ آئے: "وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ" اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا: "وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا" کہ اے نبیؐ' بشارت دینا اور انذار کرنا آپؐ کا کام ہے۔ گویا اصل قوت اور طاقت اس قرآن میں ہے جو اللہ کا کلام ہے!

(جاری ہے)

ہر مسلمان پر

حسب صلاحیت و استعداد

قرآن مجید

کے مندرجہ ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں

① ـــــ ایمان و تعظیم ـــــ یہ کہ اُسے مانے

② ـــــ تلاوت و ترتیل ـــــ یہ کہ اُسے پڑھے

③ ـــــ تذکّر و تدبّر ـــــ یہ کہ اُسے سمجھے

④ ـــــ حکم و اقامت ـــــ یہ کہ اُس پر عمل کرے

⑤ ـــــ تبلیغ و تبیین ـــــ یہ کہ اُسے دوسروں تک پہنچائے

ان حقوق سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شہرۂ آفاق تالیف

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

کا مطالعہ اِن شاء اللہ العزیز بے حد مفید ہوگا

خصوصیاتِ صحابہ کرامؓ
قرآن حکیم کی روشنی میں (۳)

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے بارے میں احترام قانون کی سختی

رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو شارحِ دین اور شاہدِ دین تھے وہ مومنِ دین بھی تھے۔ حضورؐ کو بھی آمرِ مطاقؒ اور حاکمِ حقیقیؒ کی طرف سے قانونِ الٰہی اور شریعتِ خداوندی پر ایمان لانے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جس امتِ مسلمہ کے لیے دعا کی تھی آپؐ کی ذاتِ اقدس بھی اس امت میں داخل تھی۔ اس امت میں جس رسولؐ کی بعثت کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے درخواست کی تھی اس کے الفاظ بھی یہی تھے: "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ" (اس امت میں سے ان کی ہدایت کے لیے ایک رسول مبعوث فرما!)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایتِ خداوندی کے مطابق اپنے آپ کو "اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ" (الانعام' ۱۶۳) فرمایا۔ آپؐ کو حکم دیا گیا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ (الشوریٰ: ۱۵)

"اے نبی! اعلان کر دو کہ میں خود بھی خدا کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لایا ہوں۔"

اور مجھے بحیثیت ایک نائب و خلیفہ تمہارے اندر انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (الشوریٰ ۱۵)

اور اگر کسی موقعہ پر اجتہادی سہو ہو گیا تو حاکمِ حقیقی کی طرف سے آپ کو ٹوکا گیا:

لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (التحریم : ۱)

یعنی اے نبی! تم نے خدا کی حلال کی ہوئی چیز (شہد) کو نہ کھانے کا عہد کر کے اسے حرام کیوں کر لیا؟ پھر آپؐ نے کفارۂ قسم ادا کر کے اس عہد کو ختم کیا۔

رسول پاکؐ معصوم تھے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ سے کبھی کوئی گناہ اخلاقی یا شرعی سرزد نہیں ہوا، البتہ اگر کبھی کسی مصلحت کے تحت اجتہادی غلطی سرزد ہوئی تو وحیٔ آسمانی نے اس کی اصلاح کر دی اور آپؐ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ پھر ائمۂ اہل بیت کے حق میں معصوم ہونے کا عقیدہ کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا وہ اجتہادی غلطیوں سے بھی محفوظ تھے؟ تو پھر ان کا مقام تو نبوت سے بھی بلند ہو گیا اور درجۂ الوہیت تک پہنچ گیا۔ اور اگر بشریت کے تقاضے سے وہ حضرات اجتہادی سہو میں مبتلا ہوئے تھے، تو پھر اس سہو و غلطی کی اصلاح کیسے ہوتی تھی؟ کیا ان پر بھی وحیٔ آسمانی کا نزول ہوتا تھا؟ دلی کے مشہور تاریخی کالج (دلی کالج اجمیری گیٹ) کے پرانے پرنسپل سید موسوی صاحب نے ایک روز اپنے شاگردوں سے کہا: "ہم امت نہیں، امت سے اپر کلاس ہیں۔" ساداتِ کرام کی عظمت بیان کرتے ہوئے یہ فقرے کہے۔

یہ وہی تصور ہے جو بنی اسرائیل کے اندر دوسری قوموں کے مقابلہ میں پھیلا اور شیعہ صاحبان نے اس تصور کو پوری امتِ محمدیہ کے مقابلہ میں اپنے لیے وجہِ فخر قرار دیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ سیاسی غلطی تھی کہ انہوں نے خلافت کا نظام مستحکم ہونے سے پہلے ہی سابق گورنروں کو معزول کرنا شروع کر دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے انہیں مشورہ دیا کہ ابھی خونِ عثمانؓ کی شورش بپا ہے، ابھی آپؓ گورنروں میں ردّ و بدل نہ کریں، خاص کر امیر معاویہؓ کو نہ چھیڑیں، لیکن حضرت علیؓ کا جوش (جو اگرچہ جذبۂ حق تھا) باز نہ آیا اور آپ نے حضرت معاویہؓ کو شام کی گورنری سے معزول کر کے خلافت میں انتشار کی دعوت دیدی۔ یہ اجتہادی غلطی کی مثال ہے۔ اس فیصلہ میں حضرت علیؓ کی بری نیت کا کوئی دخل نہ تھا۔

امت مسلمہ کے دو دور، بنی اسماعیل اور خیر امت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس اُمتِ مسلمہ کی دعا کی تھی اسے اپنی اولاد اور ذرّیت میں سے منتخب کرنے کی درخواست فرمائی تھی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

(البقرہ : ۱۲۸)

"اے ہمارے رب! ہم دونوں (باپ بیٹوں) کو اپنا فرماں بردار بنا لے اور ہماری اولاد میں سے بھی اپنی ایک فرمانبردار امت بنا"

آپؑ نے اسی فرماں بردار امت میں سے ایک نبی مبعوث فرمانے کی درخواست کی: وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ۔ (البقرہ : ۱۲۹)

"اور ان میں ایک رسول مبعوث فرمائیو انہی میں کا"

خیرِ امت، عالمگیر اُمت، اصولی جماعت

یہ اُمتِ مسلمہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کے بعد نبی آخر الزماںؐ تک ذرّیتِ ابراہیم کے دائرہ میں محدود رہی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعاء کو خاتم الانبیاءؐ کی صورت میں قبول فرمایا۔ آخری رسول عالم گیر رسول تھے، اس لیے آپؐ کی نسبت سے وہ امتِ مسلمہ ایک عالم گیر امت کی حیثیت سے کھڑی ہوئی۔ قرآن کریم نے اسے "خیرِ امت" اور "امۃً وسطاً" قرار دیا، یعنی جس امت میں بھلائی اور خیر ہو اور جو امت اپنے فکر و عمل میں اعتدال پسندی کی راہ پر گامزن ہو۔ (البقرہ: ۱۴۳) اور یہ خیر امت ہر قسم کے رنگ و نسل کے بھید بھاؤ کے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے منصب پر فائز کی گئی۔ (آل عمران : ۱۱۰)

خیرِ امت کا اوّلین مصداقِ کامل : جماعت صحابہؓ

آل عمران کی اس آیت کی تفسیر میں امام ابنِ کثیرؒ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشادِ گرامی نقل کیا ہے - ابولہب کی بیٹی حضرت درّہ روایت کرتی ہیں کہ ایک شخص نے حضورؐ سے سوال کیا، جبکہ آپؐ اپنے منبر پر رونق افروز تھے - اس نے پوچھا:

" یارسولَ اللہ! ایُّ النّاس خیرٌ ؟ " قال : " خیرُ النّاسِ اَقرأُھم و اَتقاھم للہ وآمرُھم بالمعروف وانہاھم عن المنکر واَوصلُھم للرّحم ."

" حضورؐ! لوگوں میں بہتر کون ہے ؟ " آپؐ نے فرمایا: "لوگوں میں بہتر وہ ہے جو ان میں کتاب الٰہی کا زیادہ عالم ہو، خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہو، بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں ان سے آگے ہو، اور قرابت داری کا حق ادا کرنے میں بھی سب سے بڑھ کر ہو۔"

حضورؐ کی اس تشریح میں اس امت کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں اور اس خیرِ امت کے عالم گیر اصولی جماعت ہونے کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے ۔تفسیر مدارک میں امام سدی کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا یہ قول منقول ہے :

" ھی للاصحاب خاصۃ لقولہ کنتم ولو قال انھم یعم کلنا ."

یعنی خیرِ امت سے صحابہ کرامؓ مراد ہیں، کیونکہ "کُنتُم" خطاب حاضر ہے (اور مخاطب حاضر جماعتِ صحابہ ہے) اگر "کُنتُم" کے بجائے "اَنتُم" یعنی ضمیر غائب ہوتی تو تمام اہلِ ایمان مراد ہوتے۔ (ابنِ ابی حاتم)

مسند احمد میں حضرت ابنِ عباسؓ کا ایک اثر یہ مروی ہے کہ :

"ھُمُ الّذِینَ ھَاجَرُوا مَعَہٗ صلی اللہ علیہ وسلم"

یعنی خیرِ امت سے مراد مہاجرین ہیں۔ (حاشیہ جلالین ۵۸)

حافظ ابنِ کثیر کا فیصلہ یہ ہے کہ خیرِ امت صرف صحابہ کرامؓ کی جماعت نہیں ہے بلکہ پوری امت مراد ہے، البتہ فضیلت و خیریت کے درجات مختلف ہیں، جیسا کہ

حدیث میں آتا ہے :

خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ "

یعنی سب سے بہتر زمانہ میرا ہے۔ یہ دورِ صحابہؓ ہے، پھر اس سے متصل زمانہ ــــ یہ تابعین کا دور ہے، پھر اس سے متصل ــ یہ تبع تابعین کا عہد ہے۔

حضرت عمرؓ کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خیرِ امت کا اعلیٰ مصداق مہاجرین کی جماعت ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ صحابہؓ کے بعد کا دور خیرِ امت کے لقب سے محروم ہے۔

ایک حدیث میں حضورؐ نے اپنی نبوت کے پانچ امتیازات بیان فرمائے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے :

وَجُعِلَتْ اُمَّتِیْ خَیْرَ الْاُمَمِ

" میری امت تمام امتوں سے بہتر ہے "

شخصی نسبت سے احتراز

قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے چھوٹے صاحبزادے (اسحاقؑ) کی اولاد کو حضرت یعقوبؑ ابنِ اسحاقؑ کی نسبت سے بنی اسرائیل کہا ہے۔ لیکن دوسرے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کو بنی اسماعیلؑ اور بنی محمدؐ نہیں کہا۔ سورۃ الاحزاب کی مشہور آیت " اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ " میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو ایمان والوں کی ماں کہہ کر التزامی دلالت کے پیرایہ میں حضورؐ کو ایمان والوں کا باپ کہا ہے۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ کی قراءت میں " وَهُوَ اَبُوْهُمْ " (اور وہ نبیؐ ان کا باپ ہے) موجود ہے، لیکن دلالت صریحی والی اس قراءت کو قراءتِ مشہور نہیں بنایا گیا، کیونکہ احتیاط اسی میں تھی۔ اس آیت میں بھی باپ اور ماں کی نسبت تعظیمی اور احترامی ہے، نہ کہ نسبی اور صلبی۔ نسبی نسبت کی واضح طور پر سورۃ الاحزاب

ہی کی آیت نمبر۴۰ میں نفی کر دی گئی:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۰

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

"یعنی کسی کو اس کا بیٹا نہ جانو مگر رسول اللہ کا ہے، اس حساب سے سب اس کے بیٹے ہیں۔"

یعنی حضورؐ اپنی امت کے روحانی باپ ہیں اور ایک استاد کا درجہ باپ سے زیادہ ہوتا ہے۔ شخصی نسبت سے یہ احتراز اس لیے کیا گیا ہے کہ اس سے شخصیت پرستی پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

توحید کی حفاظت کے لیے جس طرح اسلام نے شخصی نسبت سے احتراز کیا ہے اسی طرح قرآن کریم نے ایک بڑی اہم احتیاط بھی کی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو جہاں اور جن آیات میں حج کعبۃ اللہ کی ہدایت کی ہے وہاں "بیت اللہ" کی نسبت نہیں ہے۔ کہیں "اوّل بیت" ہے، کہیں "بیت العتیق" اور "بیت الحرام" ہے۔ خدا کے گھر کی نسبت میں ایک لامکان ذات کی طرف مکان کی نسبت ہو جاتی ہے۔ یہ تاویل کے درجہ میں تعظیمی نسبت سہی، لیکن قرآن نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے۔

تنظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کا نقیب

ماہنامہ میثاق لاہور

زیرادارت: ڈاکٹر اسرار احمد

فی شمارہ ۔/۵ روپے سالانہ زر تعاون ۔/۵۰ روپے

خودی کا انقلاب (۵)

ارتقائی حرکت کا ہمہ گیر قانون

عقلی طور پر یہ حقیقت قدرت کے جس قانون کی مظہر ہے کائنات کی ساری ارتقائی حرکت اُسی پر مبنی ہے۔ جب زندگی کی کوئی مخفی قوت ارتقاء کے کسی مرحلہ پر ایک حد تک آشکار ہو جاتی ہے تو پھر زندگی ارتقاء کے مقاصد کی پیش بُرد کے لیے اس حد تک اپنی کسی مخفی قوت پر نہیں بلکہ اپنی آشکار قوت پر انحصار کرتی ہے، اسی کو اپنا آلۂ کار بناتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے ارتقاء کے عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔ گویا زندگی 'کُن' کے عمل کو جاری رکھنے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے ہر قدم پر 'کُن' کے حاصلات ہی سے کام لیتی ہے اور اس کے موجودہ حاصلات آئندہ کے حاصلات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مثلاً زندگی نے مادی مرحلۂ ارتقاء کے اندر مادہ کی ابتدائی حالت کی شکل میں برقی قوت کے مثبت اور منفی باروں (CHARGES) کو آشکار کیا۔ مادہ کی ابتدائی حالت ان ہی باروں سے عبارت تھی پھر ان باروں کے عمل کے ذریعہ سے زندگی نے مادہ کو مزید ترقی دینے کا مقصد حاصل کیا جس سے مادہ کو نئی قوتیں حاصل ہوئیں۔ پھر ان نئی قوتوں کو مادہ کی مزید ترقی کا ذریعہ بنایا اور یہ عمل جاری رہا، یہاں تک کہ مادہ کی وہ تمام خصوصیتیں جن کو آج ہم مادی قوانینِ قدرت کہتے ہیں ظہور پذیر ہو گئیں۔ اسی طرح سے جب پہلا حیوان وجود میں آیا تو وہ فقط ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھا۔ اس خلیہ میں زندگی نے نقل و حرکت کی استعداد کے علاوہ اخذِ غذا اور توالد کی دو جبلّتیں بھی پیدا کیں جو ابتدائی حالت میں تھیں۔ زندگی نے ان دو جبلّتوں کے فطری عمل کو حیوان کی مزید ترقی کا ذریعہ بنایا، جس کے نتیجہ کے طور پر بہتر سے بہتر قسم کی انواعِ حیوانات وجود میں آتی رہیں، یہاں تک کہ حضرتِ انسان نمودار ہوا۔ انسان کی تمام فطری قوتوں میں سب سے زیادہ اہم اور مرکزی اور بنیادی قوت خدا کی محبت یا آرزوئے حسن ہے۔ اس

قوت کے عمل کے ذریعہ سے زندگی انسان کو ہزاروں سال سے متواتر ارتقاء کے مدارج طے کروا رہی ہے جس کی وجہ سے انسان کو ہر مرحلہ پر نئی نئی قوتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ علوم کا سارا ذخیرہ اور زندگی کے مشاغل کی تحسین، تزئین اور تسہیل کے سارے ذرائع اور طریقے جو انسان اب تک پیدا کر سکا ہے، اسی قوت کے بعض پہلوؤں کے عمل کا نتیجہ ہیں۔ تاہم ابھی تک نسل انسانی نے مجموعی طور پر اس قوت سے صحیح طور پر کام لینا نہیں سیکھا۔ جب انسان اپنی آرزوئے حسن کو صحیح تصورِ حسن کی محبت سے مطمئن کرتا ہے تو اس کی شخصیت اس قوت کے ساتھ ایک ہو جاتی ہے جو کائنات کے تخلیقی اور ارتقائی عمل کو حرکت دے رہی ہے اور یہ خدا کے قولِ کُن کی قوت ہے۔ لہٰذا جس حد تک کہ مومن کی شخصیت اس قوت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اس حد تک مومن کا اپنا قولِ کُن بھی کائنات کے ارتقائی عمل پر اسی طرح سے اثر انداز ہوتا ہے جس طرح سے کہ خدا کا قولِ کُن اثر انداز ہو رہا ہے کیونکہ اس حد تک خدا کا قولِ کُن مومن کے قولِ کُن کی صورت اختیار کرتا ہے۔ خدا انسان کے اندر کائنات کے ارتقاء کے آخری مرحلہ میں قولِ کُن کی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ کائنات میں اپنے آخری تخلیقی اور ارتقائی مقاصد کے حصول کے لیے اپنی اس آشکار قوت سے کام لے جس سے انسان اس کی مرضی اور اس کی تقدیر کا آلۂ کار بن جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ یہ خدا کے سابق دستور اور طریق عمل کے عین مطابق ہے۔ جب مردِ مومن خدا کا ہاتھ یا پاؤں یا کان یا آنکھ بن جاتے تو تعجب کیا ہے کہ خدا اس کے ان اعضاء سے پکڑنے، ریت پھینکنے، چلنے، سننے یا دیکھنے کا کام لے۔ خدا بننے یا خدائی کا راز دان بننے سے اقبال کا مطلب بس اتنا ہی ہے اور اس میں غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔ اقبال کے جو نکتہ چین غلطی سے سمجھتے ہیں کہ اقبال خودی اور خدا میں فرق نہیں کرتا وہ اس گزارش کو نوٹ فرمائیں۔

یک رنگی اور بیباکی

خودی کے انقلاب کے بعد مومن یک رنگ، یک دل اور یک زبان ہو جاتا ہے۔ اسے مکاری، منافقت اور ڈپلومیسی کی ضرورت نہیں رہتی۔ چونکہ مومن کے دل میں خدا کی نہایت ہی گہری اور شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے خیالات ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور وہ مرکز خدا کی ذات ہوتا

ہے۔ پھر وہ مخالف افکار و آرا اور متضاد اعمال و افعال کا شکار نہیں رہتا۔ خودی کی فطرت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات اور اعمال کو خدا کے مرکز پر جمع کرے۔ لہٰذا جب اس کے خیالات اور اعمال اس ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی فطرت کو پالیتی ہے اور اس کی زندگی کی قوت بھی ایک مرکز پر آ جانے کی وجہ سے ممکن حد تک بڑھ جاتی ہے۔

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی! خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں!

مومن کی شخصیت میں ایک مکمل وحدت اور ہم رنگی کے ساتھ ہی ایک مکمل خود اعتمادی کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے طے کیے ہوئے اعتقاد و عمل کی صحت پر اتنا بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موقف کو کسی خوف سے بدلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر زمانہ اس کے ساتھ موافقت نہ کرے تو وہ زمانہ سے موافقت نہیں کرتا بلکہ زمانہ کو بدل کر اپنے ساتھ موافق کرنے کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

لہٰذا اسے جھوٹ یا فریب یا روباہی سے، جسے اقبال حیلہ افرنگی کہتا ہے، کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ صاف صاف بات کہتا ہے خواہ نتائج کچھ ہوں۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

محبت کے اندر یکسوئی اور بیباکی اس کی محبت کو درجۂ کمال پر قائم رکھتی ہے۔ اخلاص کے بغیر محبت کی کامیابی ممکن نہیں ہوتی، لیکن اخلاص کو قائم رکھنا ذرا ہمت کا کام ہے۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یکدانہ!
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ!

زندگیٔ جاوید

خودی کے انقلاب کے بعد مومن زندۂ جاوید ہو جاتا ہے اور موت اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہماری خودی ہمہ تن خدا کی محبت ہے جو حی و قیوم ہے اور خود بخود زندگی اور حیات ہے،

اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ہم خدا کی محبت کی نشوونما کر کے درجۂ کمال پر پہنچا دیں تو ہم خود بھی خدا کی طرح جاوداں بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ضروری ہے کہ خدا کا کامیاب عشق بھی خدا کی صفات کو جذب کر کے، جن میں ایک ہمیشہ کی زندگی ہے، ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائے۔ ہمارا اور خدا کا تعلق اگرچہ ایک راز سربستہ ہے لیکن ہمارے دوام کا گواہ ہے۔

من داد چیست اسرار الٰہی است　　　من داد بر دوام ما گواہی است

جب ہم زندگی پر عاشق ہیں اور ہمارے عشق میں پوری طرح سے کامیاب ہونے کی صلاحیت ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم خود زندگی بن جائیں۔ ہمارا قدرتی مستقبل جو ہماری غیر مبدل فطرت میں پوشیدہ ہے، زندگی ہے موت نہیں، ورنہ ہم سراسر زندگی کا کامیاب عشق نہ بن سکتے۔ زندگی سانس کا یہ آنا جانا نہیں، بلکہ اس کا منبع خدا ہے جو حیّ و قیوم ہے اور جس کی محبت ہماری فطرت میں ہے۔

زندگانی نیست تکرارِ نفس
اصلِ اُو از حیّ و قیوم است و بس

ضروری ہے کہ زندگی کا عشق بھی ایک ایسی زندگی ہو جو زندگی کے اصل مرکز یا منبع سے کھو چکی ہو اور پھر اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی خواہش رکھتی ہو۔ اور اسی خواہش کی وجہ سے وہ عشق بن گئی ہو۔ عشق کا اصل زندگی کی طرف لوٹنے کی تمنا کرنا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ زندگی کو پا سکے گا جس کے بعد موت اس پر حرام ہو جائے گی کیونکہ عشق حقیقی کی تمنا ناکام نہیں ہوتی۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام
اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

جسمِ حیوانی اور شخصیتِ انسانی کی مماثلت

ایک جسمِ حیوانی کی صحت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے اندر زندگی کی رَو کس قدر قوی ہے۔ اگر جسمِ حیوانی میں زندگی کی رَو قوی ہو تو وہ موت لانے والے عوامل یعنی بیماریوں اور جراثیمی

سرایتوں پر بآسانی غالب آجاتا ہے۔ بیمار، کمزور اور نحیف جسم حیوانی کے اندر زندگی کی رو کمزور ہوتی ہے اور وہ بیماریوں اور جراثیمی سرایتوں کو قبول کرنے کے لیے اور بھی مستعد ہوتا ہے۔ جسم حیوانی کی صحت اور زندگی کی رو کی قوت کا دارومدار اس کی خوراک کی عمدگی پر اور صحت کو قائم رکھنے والے دوسرے حالات کی موجودگی پر اور نیز اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کی جسمانی نشوونما اور پرورش کیسے ہوتی ہے۔

اسی طرح سے انسان کی روح یا خودی کی صحت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے اندر زندگی کی رو جو خدا کی محبت کی صورت اختیار کرتی ہے کس قدر قوی ہے اور پھر اس رو کی قوت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کا تصورِ حسن جس سے اس کی خودی حسن کی غذا جذب کرتی ہے عمدہ اور حسین ہے یا نہیں اور اس کی زندگی کے تجربات اور اعمال وافعال خدا کی محبت سے سرزد ہوتے ہیں یا نہیں اور اس نے خدا کی محبت کی نشوونما اور پرورش کس حد تک کی ہے۔ اس زندگی میں بھی اگر روح یا خودی میں زندگی کی رو یا خدا کی محبت قوی ہو تو وہ روحانی موت لانے والے عوامل یعنی گناہوں، اخلاقی کمزوریوں اور بیماریوں پر غالب آجاتی ہے۔ خدا کی محبت سے دُور اور اخلاقی کمزوریوں اور بیماریوں سے گھری ہوئی خودی خدا سے اور دُور ہونے اور اخلاقی کمزوریوں اور بیماریوں میں اور غرق ہونے کے لیے مستعد ہوتی ہے۔ اگر ایک قوی اور توانا جسم کچھ عرصہ کے لیے خوراک اور حفظانِ صحت کے لوازمات کو ترک کر دے تو وہ کمزور اور ناتواں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر ایک قوی اور توانا خودی جس میں زندگی یا خدا کی محبت کی رو طاقتور ہو، کچھ عرصہ کے لیے خدا کی مخلصانہ عبادت اور حسنِ عمل کو ترک کر دے تو وہ کمزور اور ناتواں ہو جاتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس طرح سے جسم کی صحت اور زندگی کی حالت کئی درجوں کی ہوتی ہے اسی طرح سے خودی کی صحت اور زندگی کی حالت بھی کئی درجوں کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خودی کا عشق بھی اپنی قوت اور شدت کے لحاظ سے کئی درجوں کا ہوتا ہے۔ جس قدر زیادہ کوئی انسان خدا کی محبت سے بہرہ ور ہوگا اسی قدر زیادہ وہ زندگی سے بہرہ ور ہوگا۔

زندگی کے مدارج اور حیاتِ مطلق

زبورِ عجم میں اقبال نے زندگی کے درجوں کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو ذرا وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی اور موت اعتباری اوصاف ہیں جن کا دارومدار حالات پر ہے۔ جہاں تک نوا

کے سوز اور اثر کا تعلق ہے ہم کہیں گے کہ ایک بہرہ مردہ ہے۔ اسی طرح سے ایک اندھا جو بہرحال نوا سے مست اور مسرور ہو جاتا ہے رنگ کی طرف سے مردہ ہے۔ رُوح خدا سے زندہ اور پائندہ ہوتی ہے اور خدا سے ہٹ جائے تو خدا کی طرف سے مردہ اور غیر خدا کی طرف سے زندہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیاتِ مطلق کیا ہے؟ اقبال کہتا ہے کہ حیاتِ مطلق یہ ہے کہ انسان خدا کے ساتھ زندہ رہے کیونکہ خدا وہ زندہ ہستی ہے جو خود بخود زندہ ہے اور مرتی نہیں۔ جو خدا کے بغیر زندہ ہے وہ موتِ مطلق سے مرا ہوا ہے اگرچہ وہ بظاہر زندہ نظر آرہا ہو اور لوگ اس کا ماتم نہ کر رہے ہوں۔

مردن وہم زیستن اے نکتہ رس — ایں ہمہ از اعتبارات است و بس
مُردِ کر سوزِ نوا را مردہ — لذتِ صوت و صدا را مردہ
پیشِ چنگے مست و مسرور است کور — پیشِ رنگے زندہ در گور است کور
رُوحِ باحق زندہ و پائندہ است — ورنہ ایں را مردہ، آں را زندہ است
آنکہ حیّ لایموت آمد حق است — زیستن باحق حیاتِ مطلق است
ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست — گرچہ کس در ماتمِ اُو زار نیست

کامل زندگی اس شخص کی قسمت میں ہوتی ہے جو خدا کی محبت کو عبادت اور حسنِ عمل سے ترقی دے کر کمال کے اس درجہ تک پہنچا دے جہاں وہ خدا کو دیکھ لے اور زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے۔ خدا کا دیدار زندگی ہے اور زندگی خدا کا دیدار ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے کہ خدا احسان والوں کو پسند کرتا ہے۔ (وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ) اور حدیث شریف میں ہے کہ احسان کا مقام یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت اس طرح سے کرے کہ گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے (اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ) یہی وہ مقام ہے جہاں انسان بندِ زمان و مکان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ انبیاء جو خدا کی مخلصانہ عبادت کی دعوت دیتے ہیں وہ دراصل احسان یا دیدارِ حق کے مقام کو پانے کی دعوت دیتے ہیں لیکن اس دعوت کا نتیجہ احسان ہی نہیں بلکہ کمالِ زندگی بھی ہے۔ لہٰذا دیدارِ حق اور کمالِ زندگی ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایمان والو خدا اور رسول کی پکار کو سنو جب وہ تم کو اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندہ کرنے والی ہے (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ) اقبال قرآن اور حدیث کے ان مضامین کو ایک شعر میں جمع کرتا ہے:

کمالِ زندگی دیدارِ ذات است
طریقش رستن از بندِ جہات است

ایسے زندہ دل باکمال عاشقِ صادق کو ہی خطاب کرکے اقبال کہتا ہے:

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے!
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے!
مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے!
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے!

زندہ رہنے کی شرط

زندہ رہنے کی شرط یہ ہے کہ انسان خودی کے اس کمال تک پہنچے جہاں وہ زمان و مکان (جن سے یہ جہاں بنا ہے) کی حدود کو عبور کر جائے اور اس طرح سے خود زمان و مکان سے آزاد ہو کر زمان و مکان (جہاں) کو خودی کے دام میں لے آئے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی خودی زمان و مکان کے دائرہ میں مقید رہے گی تو وہ موت کے بعد زندہ نہیں رہ سکے گا۔ حیات یہی تو ہے کہ جہاں کو خودی کا قیدی بنایا جائے۔ جو شخص خود جہان کا قیدی ہے وہ جہان کو اپنا قیدی کیسے بنا سکتا ہے۔

حیات چیست؟ جہاں را اسیرِ جاں کردن
تو خود اسیرِ جہانی کجا توانی کرد!

خدا سے دُور ہونا موت ہے۔ جو انسان زندہ ہو وہ خدا سے دُور نہیں ہوتا اور جو دُور ہوتا ہو وہ زندہ نہیں ہوتا۔

بے حضوری ہے تیری موت کا راز
زندہ ہو تُو تو بے حضور نہیں!

ابدیت کی ابتدائی شرط عشق ہے۔ اگر اس کے کچھ اور اصول اور لوازمات بھی ہیں تو وہ سب عشق کے ماتحت ہیں۔ جس حد تک کہ عقل مادی عناصر کی ترتیب کا نتیجہ ہے اور مادی دنیا کے اندر

تصرف کرنے کے لیے کام میں آتی ہے' وہ جسم کی موت سے فنا ہو جاتی ہے' لیکن عشق کسی حالت میں فنا نہیں ہوتا۔ اگر موت ایک شام ہے تو عشق ایک سورج ہے۔ سورج کے سامنے شام کہاں رہ جاتی ہے۔ عشق خود زندگی کا ہی سوز ہے۔ جہاں یہ سوز ہوگا وہاں زندگی ضرور ہوگی اور جہاں زندگی ہوگی وہاں موت کیسے ہو سکتی ہے۔ عشق کا مرنا زندگی کا مرنا ہے' جو محال ہے:

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق — عقلِ انسانی ہے فانی' زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — عشق سوزِ زندگی ہے' تا ابد پائندہ ہے

انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کی خودی کمال تک پہنچے۔ اگر زندگی کا صدف خودی کے قطرۂ نیساں کو گہر بنا کر حالتِ کمال تک نہیں پہنچا سکتا تو بے سود ہے۔ خودی کے کمال کے معنی یہ ہیں کہ خودی خود نگر ہو جائے' یعنی خدا کا دیدار پا کر اپنے آپ کو دیکھ لے' خود گر ہو جائے یعنی خدا کے عشق سے اپنی تعمیر اور تربیت کو مکمل کر لے' اور خود گیر ہو جائے۔ یعنی اپنے آپ کو غیر اللہ سے ہٹا کر پوری طرح سے اپنی گرفت میں یعنی اپنے اصلی محبوب کی محبت کی گرفت میں دے دے۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے تو پھر خودی جسم کی موت سے بھی مر نہیں سکتی۔

زندگانی ہے صدف' قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے تو موت سے بھی مر نہ سکے!

عاشقِ کامل کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ زندگی یعنی خدا کے عشق سے بہرہ ور ہے۔ حالتِ عشق سے پہلے انسان کو شک رہتا ہے کہ وہ بعد از مرگ زندہ رہے گا یا نہیں۔

در بود و نبود من اندیشہ گماں ہا داشت — از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من

حیات بعد الممات کا ثبوت

پھر بھی موت نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اسے موت ہر طرف سے گھیرتی ہے۔ پھر بھی وہ مرکر عذاب سے نجات نہیں پاتا۔ (وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ)۔ اقبال اسی زندگی کو ہی موت کہتا ہے، ورنہ موت نما زندگی تو بعد از مرگ کافر کو بھی ملتی ہے۔ اور اسی موت نما زندگی کی وجہ سے اس کا بعد از مرگ عذاب دوزخ ممکن ہوتا ہے۔ شعور جب خود شعور یا خود شناس ہو جائے جیسا کہ انسان کا شعور ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں جب شعور انسانی سطح پر آجائے تو وہ خواہ کافر کا شعور ہو، حیوان کے غیر خود شعور غیر خود شناس شعور کی طرح موت کے معمولی معنوں میں مر نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم کی زندگی میں بھی ایسے خود شناس شعور کے وجود کا انحصار جسم پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی زندگی جسم سے الگ تھلگ اور بے نیاز ہوتی ہے۔ اسی خود شعور یا خود شناس شعور کو ہم انسانی شخصیت یا خودی یا روح کا نام دیتے ہیں اور یہ صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوان خود شناسی یا خود شعوری کے وصف سے محروم ہے، کیونکہ حیوان فقط جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہے لیکن انسان جب جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہے تو وہ جانتا بھی ہے کہ وہ جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہے۔ اسی حقیقت کو ہم مختصر الفاظ میں یوں ظاہر کرتے ہیں کہ حیوان فقط باشعور ہے، اور انسان خود شعور بھی ہے۔ اسی خود شعوری کی وجہ سے انسان اپنے وجود کا، اپنی انا کا، اس کی وحدت کا اور اس کے تسلسل کا احساس کرتا ہے۔ اگر ایک انسان زید سو سال تک بھی زندہ رہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہی زید ہے جو چار سال کی عمر میں تھا۔ اس کے حافظہ میں اس کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات جن سے پورا ایک دفتر بن سکتا ہے محفوظ ہوتے ہیں۔ اگر وہ کچھ واقعات کو بھول بھی جاتے تو پھر بھی وہ اس کے لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک تحلیلِ ذہنی کا ماہر اس پر ہپناٹک نیند طاری کرکے ان کی پوری تفصیلات اس کے منہ سے کہلوا سکتا ہے اور بیداری کے وقت اس سے اقرار کروا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع ظہور پذیر ہوئے تھے۔

اعمال کا نہ مٹنے والا ریکارڈ

آج ماہرینِ تحلیلِ نفسی کے تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کا کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں ہوتا جو مٹ جائے۔ بلکہ ہر عمل کا ریکارڈ اس کے لاشعور کے اندر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ واقعات کا یہ حیرت انگیز نہ مٹنے والا ریکارڈ انسان

نہیں۔اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق انسان کی خودشعوری یا خودی سے ہے جو جسم سے الگ تھلگ اپنی زندگی بسر کرتی ہے اگرچہ جسم پر حکمرانی کرتی ہے اور اپنے مقاصد کے لیے اسے بطور ایک آلہ کے استعمال کرتی ہے۔اگر اس کا تعلق جسم سے ہوتا تو ہر تین سال کے بعد یہ فنا ہو جاتا اور انسان کی زندگی کا تسلسل ٹوٹ جاتا کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ کم وبیش ہر تین سال کے بعد دماغ کے تمام مادی ذرات مٹ کر نئے مادی ذرات کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ چار سال کی عمر سے لے کر سو سال کی عمر تک یہ عمل بتیس دفعہ ہو چکتا ہے۔نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ شخصیت یا خودی یا خودشعوری جسم سے بے نیاز ہو کر اپنے وظائف ادا کرتی اور اپنی زندگی قائم رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودی جسم کی موت سے نہیں مرتی۔ دماغ اور جسم خودی کے آلات ہیں جن کی مدد سے وہ اس دنیا میں اپنا کام کرتی ہے اور اپنے اعمال، افعال اور اپنے تجربات کو ترتیب دیتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ اگر دماغ کو کوئی نقصان پہنچ جاتے تو خودی اپنے وظائف ٹھیک طرح سے یا پوری طرح سے ادا نہیں کر سکتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خودی اور دماغ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔کیونکہ جیسا کہ نفسیاتِ دیوانگی کی تازہ تحقیقات سے ظاہر ہے دماغ کے مختل ہونے کے بعد بھی شخصیت لاشعور میں موجود رہتی ہے۔اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ خودی کا آلہ شکستہ ہو جانے کی وجہ سے خودی کو شعور کی دنیا میں کام نہیں دے رہا لیکن جب دماغ اور جسم خودی کے آلات کے طور پر صحت مند ہوں تو ان آلات کی مدد سے ہر تجربہ جو خودی کو حاصل ہوتا ہے اور ہر فعل جو اس سے سرزد ہوتا ہے، دماغ اور جسم کی وساطت کے بغیر خودی کا جزو بن جاتا ہے اور پھر ہمیشہ بنا رہتا ہے۔اور جسم کے مر جانے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ جسم کی زندگی میں بھی یہ تجربہ یا فعل جسم کا نہیں بلکہ خودی کا حصہ تھا اور خودی جسم کی زندگی میں اگرچہ جسم کو کام میں لاتی تھی تاہم جسم سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کو قائم کیے ہوئے تھی۔یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ہے کہ انسان کے اعمال لکھے جاتے ہیں اور موت کے بعد اس کا اعمالنامہ اس کے سامنے کھل جاتا ہے (کِتَابًا یَّلْقٰـہُ مَنْشُوْرًا) اس سے ظاہر ہے کہ شخصیت وہی کچھ ہوتی ہے جو اس کے اعمال اس کو بنا دیتے ہیں اور جسم کی موت کے بعد اس کی خوشی یا ناخوشی، صحت یا بیماری، قوت یا کمزوری اور اس کی زندگی کے کمال یا نقص کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے اعمال کہاں تک خودی کی

فطرت کے مطابق تھے۔ یعنی ان میں خدا کی مخلصانہ محبت کا حصّہ کیا تھا۔ جب خدا کی محبّت کمال پر ہو تو خودی کی خودشناسی اور لہٰذا زندگی بھی کمال پر ہوتی ہے، کیونکہ خودی کی خودشناسی یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کو اپنی فطری استعداد کے مطابق پُوری طرح سے جان لے۔ اسی لیے اقبال کہتا ہے،

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے!

انسان اور حیوان کی زندگی

بعض وقت یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا حیوانات بھی مرنے کے بعد زندہ رہیں گے اور ان کے اعمال کا بھی محاسبہ ہوگا۔ یہ سوال درحقیقت زندگی اور محاسبۂ اعمال کے متعلق ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ بعد از مرگ زندگی فقط خودشعوری کے لیے ممکن ہے، کیونکہ یہی خودشعوری ہے جو جسم کی زندگی میں بھی جسم سے الگ رہ کر اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور یہی خودشعوری ہے جو آزاد اور بااختیار فیصلوں کی قوت رکھتی ہے یا جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان فیصلوں سے ظہور پذیر ہونے والے اعمال کو لاشعور کا جزو بنا کر یہاں تک محفوظ رکھے کہ وہ بعد از مرگ بھی اسی حالت میں رہیں۔ حیوانات چونکہ خودشعور نہیں، وہ اپنے فیصلوں اور کاموں میں آزاد نہیں، بلکہ اپنی جبلتوں کے شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہیں اور چونکہ وہ خودشعور نہیں، ان کے بعد از مرگ زندہ رہنے اور اپنے اعمال کو محفوظ رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور محاسبۂ اعمال تو بعد کی چیز ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تعارف و تبصرہ

ماہنامہ عالم اسلام اور عیسائیت اسلام آباد

گو اسلام اور موجودہ عیسائیت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے جو سیاست' معاشرت اور معاشیات سمیت انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ گوشوں پر محیط ہے' جبکہ اس کے برعکس موجودہ عیسائیت کا تعلق محض عقائد کی حد تک ہے۔ کیونکہ اس میں شریعت کا عمل دخل انفرادی زندگی میں ہو تو ہو حکومتی سطح پر سرے سے اس کا کوئی تصور موجود نہیں' مگر عملاً چونکہ مسلمان ممالک میں بھی حکومتی سطح پر اکثر و بیشتر مغربی سیکولر جمہوریت کا سکہ رائج ہے اور یا پھر بادشاہت یا آمریت کا نظام چل رہا ہے' لہٰذا بالفعل عالم عیسائیت اور عالم اسلام آج قریباً ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں۔ اور آج مسلمان غلبہ و اقامتِ دین کے مشن کو فراموش کر کے عیسائیوں کی طرح محض دعوت و تبلیغ پر قناعت کئے بیٹھے ہیں۔ باطل نظام کو بدلنے اور دین حق کو قائم و غالب کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد کرنے کا تصور بالعموم مسلمانوں کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔

"عالم اسلام اور عیسائیت" کے نام سے اسلام آباد سے "انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز" کے زیر اہتمام ایک ماہنامہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے' جس میں عیسائی مشنریوں کی عالم اسلام میں سرگرمیوں کے بارے میں دلچسپ اور مفید معلومات تحریر ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر فروری ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں شمالی امریکہ کے مسلمانوں میں تبلیغ کے لئے منعقدہ ایک کانفرنس کی روداد اس لحاظ سے خاصی اہم ہے کہ اس کے ذریعے اس امر پر وضاحت سے روشنی پڑتی ہے کہ تبلیغ کے کام کو منظم طور پر کرنے میں کن امور پر توجہ رہنی چاہئے۔ اسی طرح مارچ ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں دعوت و تبلیغ میں مناظرانہ حکمت عملی کی افادیت اور اہمیت کے بارے میں ایک دلچسپ مضمون شامل ہے۔ اسی شمارے میں "PULSE" میں "کارنیگی یا رشدی" کے زیر عنوان چھپنے والے ایک مضمون کا ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے جس میں عیسائیوں نے دعویٰ کیا ہے کہ احمد دیدات کے مقابلے میں سروش نامی ایک عیسائی مناظر نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے اور اسے کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں۔

ہمارے خیال میں دینی جماعتوں سے منسلک حضرات کیلئے اس پرچے کا مطالعہ ہر لحاظ سے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ یوں تو ملکی سطح پر بھی ہم بدقسمتی سے ہنوز مغرب کے دست نگر ہیں ہی' عیسائی دنیا کی مذہبی صورت حال سے باخبر رہنے میں کیا مضائقہ ہے!

سورۃ البقرۃ (۲۲)

آیت: ۳۳

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث: اربعہ (اللغہ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغہ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۲۳:۲ الإعراب

قال یادم انبئھم باسمائھم ج فلما انبأھم باسمائھم لا قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموت والارض لا واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون۔

اعرابی لحاظ سے اس آیت کو چار جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اسی لیے

پہلے جملے کے آخر پر وقفِ جائز کی علامت " ج " ڈالی گئی ہے۔ تاہم باقی تین جملے شرط اور جوابِ شرط ہونے کی بناء پر، اور جوابِ شرط میں سے آنے والے تین جملے بھی فعل " قال " کے مقول ہونے اور باہم حرفِ عطف (وَ) سے مربوط ہونے کی وجہ سے، سب (تینوں جملے) ایک ہی مربوط جملہ شمار ہوں گے۔ بلکہ اسی لیے اس طویل جملے میں نحوی اعتبار سے جملہ مکمل ہونے کی جگہ بھی عدم وقف (لا) کی علامت ڈالی گئی ہے تاکہ کوئی نحوی اعتبار سے مکمل جملہ سمجھ کر وہاں وقف نہ کر ڈالے۔ ذیل میں نحوی اعتبار سے مکمل ہونے والے چار جملوں کے اعراب پر الگ الگ نمبروار بات کی جائے گی۔ اور ساتھ بتا دیا جائے گا کہ اس جملے کا سابقہ جملے سے کیا تعلق ہے :

(۱) قال یا آدمُ انبئھم باسمائھم :

[قال] فعل ماضی معروف ہے جس میں ضمیر فاعل " ھو " مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ [یا آدم] (یہ رسم املائی ہے، رسم عثمانی پر الگ بات ہوگی) میں " یَا " حرفِ ندا " اور " آدم " منادیٰ مفرد اور عَلَم (نام) ہے لہٰذا ضمہ پر مبنی ہے (اور ایک لحاظ سے اسے مرفوع بھی کہہ سکتے ہیں)۔ [انبئھم] میں " اَنْبِئْ " فعل امر کا صیغہ ہے جس میں ضمیر فاعل (مخاطب۔ انتَ) مستتر ہے۔ اور آخر والی " ھُمْ " ضمیر منصوب مفعول بہ ہے جو یہاں " ملائکہ " کے لیے ہے۔ [بِاَسمائھم] میں " بِ " تو فعل " انبِئْ " کا صلہ ہے اور " اسماء " مجرور بالجر (بِ) بھی ہے اور آگے مضاف بھی ہے لہٰذا خفیف ہے اور آخری " ھم " یہاں ضمیر مجرور مضاف الیہ (مجرور بالاضافۃ) ہے جو ان " مسمّیات " (نام دھری چیزوں) کے لیے ہے جن کے ناموں کی بات ہو رہی ہے اور چونکہ ان چیزوں میں عاقل اور غیر عاقل دونوں طرح کی مخلوق شامل تھی اس لیے ان کے لیے ضمیر (ھم) عاقل کی طرح آئی ہے۔ اس طرح اس (باسمائھم) کو مفعول ثانی سمجھ کر محلاً

منصوب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اگر چاہیں تو اس مرکب جاری (باسمائھم) کو متعلق فعل (انبِئْ) قرار دے لیں یعنی "ان کو بتا" کی وضاحت ہے کہ "کیا بتا؟" اور یہ پورا جملہ (انبئھم باسمائھم) ابتدائی فعل "قال" کا مفعولٌ (مقول۔ جو بات کہی جائے) ہے۔ لھذا نحوی اعتبار سے یہ جملہ محلاً منصوب ہے۔ ــــ یہاں پہلا جملہ مکمل ہوتا ہے۔

(۲) فلما انبأهم باسمائھم قال الم اقل لکم :

[فلما] کی "فاء" (ف) عاطفہ بمعنی "پس، پھر" ہے اور یہ (فَ) ایک محذوف العبارۃ مگر مفہوم المعنی جملہ (جو عبارت میں نہیں مگر سمجھا جا سکتا ہے) مثلاً "فَأنبأهم باسمائھم = پس اس نے ان کو ان کے نام بتا دیئے" ــــ پر عطف ہے یعنی "فاء" اس محذوف مگر مفہوم جملے کو اگلے جملے کے ساتھ ملاتی ہے ــــ اور [لمّا] حینیہ ظرفیہ ہے یعنی یہ "حین" (وقت) کے معنی دیتا ہے (جب۔ جس وقت) لھذا اس میں ایک طرح سے شرط کا مفہوم موجود ہے (اگرچہ اس کا فعل پر ــ ماضی ہونے کی وجہ سے کوئی عمل نہیں ہوتا)۔ [انبأهم] میں "انبأ" فعل (ماضی معروف) مع ضمیر فاعل "ھو" ہے اور "ھُمْ" اس فعل (انبأ) کا مفعول بہ اول ہے (اور اس لیے یہاں یہ ضمیر منصوب آئی ہے) [باسمائھم] (مندرجہ بالا ۱ والے "باسمائھم" کی طرح جار مجرور (مرکب اضافی) مل کر یہاں محلاً منصوب (بطور مفعول ثانی) یا متعلق فعل ہے ــــ اور چونکہ ظرف ہمیشہ مضاف ہو کر آتا ہے (قبل، بعد وغیرہ کی طرح) اس لیے نحوی حضرات اپنی فنی اصطلاح میں یہاں اس جملے "انبأهم باسمائھم" کو "لَمّا" (ظرف) کا مضاف الیہ قرار دے کر اسے محلاً مجرور کہتے ہیں۔ تاہم اس دقیق فنی بازیگری سے عام ترجمہ میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس فنی نکتہ کی بناء پر تو پھر "لمّا" بمعنی "بعد" لینا پڑے گا اور جملہ کے مضاف الیہ ہونے

کی بناء پر ترجمہ کچھ یوں ہو جائے گا: "پس اس کے اُن کو اُن کے نام بتا دینے کے بعد"۔ جو خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ عبارت کا سیدھا ترجمہ "حصہ" اللغۃ" میں دیا جا چکا ہے۔

[قال] فعل ماضی مع ضمیر فاعل "ھو" ہے جو یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور سابقہ جملہ "فلما أنبأھم باسمائھم" میں "لمّا" کی وجہ سے جو شرط کا مفہوم پیدا ہوا تھا، اب اس "قال" سے اس کا جواب شرط شروع ہو رہا ہے (تاہم اس شرط اور جواب شرط میں کوئی جازم مجزوم نہیں آیا) اور شرط اور جواب شرط مل کر ایک ہی مربوط جملہ بنتا ہے، اس لیے یہاں جواب شرط کے "قال" سے پہلے عدم وقف کی علامت (لا) ڈالی جاتی ہے۔

[أَلَمْ أَقُلْ] میں "أ" (ہمزہ) استفہامیہ ہے، "لَمْ" حرف نفی اور جازم ہے جس کی وجہ سے فعل مضارع "اَقُلْ" (جو صیغہ واحد متکلم مع ضمیر فاعل "انا" ہے) مجزوم ہو گیا ہے۔ علامت جزم اس میں آخری "لام" کا سکون (لْ) ہے۔ منفی پر استفہام داخل ہو تو اسے استفہام تقریری (اردو میں اقراری) کہتے ہیں یعنی یہاں "کیا نہیں کہا میں نے" کا مطلب ہے "ضرور کہا تھا"۔ [لکم] جار (ل) اور مجرور (ضمیر "کم") مل کر متعلق فعل (لَمْ اَقُلْ) ہے یعنی تم کو/سے (کہا)۔

(۳) اِنِّیْ اَعْلَمُ غیبَ السمواتِ والارضِ :

[اِنِّیْ] یہ "اِنَّ" اور اس کے اسم (ضمیر منصوب "ی") پر مشتمل ہے۔ یہاں درمیانِ جملہ میں [کیونکہ دراصل یہ (جملہ ۳) سابقہ جملہ (۲) کے آخری حصہ (الم اقل لکم) کا ہی حصہ (بطور مقول) بنتا ہے] "أَنَّ" کی بجائے "إِنَّ" اس لئے استعمال ہوا ہے کہ فعل "قَالَ" (یا اس کے مشتقات) کی صورت میں یہ جائز ہے (دوسرے افعال ہوں تو درمیانِ جملہ "أَنَّ" ہی آتا ہے)۔ تاہم اردو محاورے کے مطابق (فعل "کہا" کے بعد)

یہاں " اِنّ " کا ترجمہ " أنّ " کی طرح " کہ بے شک " سے کیا گیا ہے۔ دیکھئے اوپر حصہ " اللغۃ " میں اس عبارت (اِنّی اعلم) کے تراجم ——— [أعلم] فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعل " أنا " ہے اور یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس فعل سے جو جملہ شروع ہو رہا ہے یہ " اِنّ " (اِنّی والا) کی خبر بنے گا۔ [غَیبَ] فعل (اعلم) کا مفعول (لہٰذا منصوب) ہے اور آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف (تنوین اور لام تعریف سے خالی) بھی ہے اور [السموات] " غیب " کا مضاف الیہ (یعنی مجرور بالاضافہ) ہے علامتِ نصب آخری " اتِ " ہے (جس پر " السموات " کے معرف باللام ہونے کے باعث تنوین نہیں آئی۔ اور یہ پورا مرکب اضافی (غیب السموات) فعل " أعلم " کا مفعول بہ ہے بلکہ اگلا لفظ [والارض] بھی " وَ " (عاطفہ) کے ذریعے پچھلے مضاف الیہ (السموات) پر عطف ہے اور " الارضِ " اس مجرور پر معطوف (لہٰذا مجرور) ہے۔ علامتِ جر " ضِ " کی کسرہ (ـِـ) ہے اور در اصل یہاں تک " اِنّ " (اِنّی) کی خبر مکمل ہوتی ہے۔ یوں اس جملے (اِنّی اعلم غیبَ السمواتِ والارضِ) کا ترکیب نحوی کے لحاظ سے ترتیب وار (اِنّ + (اسم اِنّ + خبر اِنّ) ترجمہ یوں ہوگا " بے شک + میں + جانتا ہوں غیب آسمانوں کے اور زمین کے "۔ اس کے مختلف با محاورہ تراجم حصہ " اللغۃ " میں بیان ہو چکے ہیں ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ یہ جملہ (۳) دراصل سابقہ جملے (۲) کا ہی ایک حصہ بنتا ہے، کیونکہ یہ " الم اقل " کا ہی مقول (مفعول) ہے، اس لیے اس جملے کے آخر میں عدم وقف کی علامت (لا) ڈالی گئی ہے تاکہ نحوی لحاظ سے مکمل جملہ سمجھ کر کوئی یہاں وقف نہ کرے۔

(۴) وَأَعلم ما تُبدون وما کنتم تکتُمون۔

[و] عاطفہ ہے جس کے ذریعے اگلے " أعلم " کا پچھلے جملے والے " أعلم " پر عطف ہے [أعلم] فعل مضارع صیغہ واحد متکلم ہے۔ " اعلم "

کی اس تکرار کی وجہ سے اس دوسرے " اعلم " کے ترجمہ سے پہلے " نیز " لگنا چاہیئے یعنی " اور میں .... کو بھی جانتا ہوں "۔ [مَا] اسم موصول ہے جو یہاں فعل " اعلم " کے مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اگرچہ مبنی ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی علامتِ اعراب ظاہر نہیں ہوتی ۔
[تُبْدُوْنَ] فعل مضارع معروف ہے جس میں بلحاظ صیغہ ضمیر فاعلین " انتم " مستتر ہے جو یہاں " ملائکہ " کے لیے ہے ۔ اس کے بعد ایک ضمیر عائد محذوف ہے (یعنی دراصل " تبدونہ " تھا)۔ یہ (تبدون) فعل فاعل مل کر جملہ فعلیہ ہے اور " مَا " کا صلہ ہے ۔ اور دراصل یہ پورا مرکب (یعنی صلہ موصول) فعل " اعلم " کا مفعول بہ ہے ۔

● خیال رہے کہ یوں تو صفت موصوف، مضاف مضاف الیہ، عطف معطوف، صلہ موصول وغیرہ مل کر ہی جملے کا کوئی حصہ (مبتدأ ، خبر، فاعل یا مفعول وغیرہ) بنتے ہیں اور اس لحاظ سے اس پورے مرکب کا ایک اعراب (رفع، نصب یا جر) ہوتا ہے مگر عموماً مرکب کے پہلے حصے (موصوف یا مضاف یا معطوف علیہ یا موصول وغیرہ) کی ہی اعرابی حالت بیان کر دی جاتی ہے (جیسے یہاں " ما " کی نصب بیان ہوئی ہے ۔)

[وَ] عاطفہ ہے جو اگلے آنے والے " مَا " کو گزشتہ " مَا " پر عطف کرتی (ملاتی) ہے [مَا] موصولہ ہے اور پہلے " مَا " کا معطوف ہے (سابقہ " ما " کو اس کا معطوف علیہ کہا جائے گا) یعنی یہ بھی فعل " اَعلم " کا مفعول بہ ہے (لھذا منصوب بھی ہے) ۔ [کُنْتُمْ] فعل ناقص (کان) مع اپنے فاعل " انتم " کے ہے جو فعل کے صیغہ میں مستتر ہے ۔ (مگر نحوی اسے " کان " کا " فاعل " کہنے کی بجائے اس کا اسم کہتے ہیں)۔
[تکتمون] فعل مضارع معروف ہے جس میں ضمیر فاعلین " انتم " موجود ہے ۔ اور یہ جملہ فعلیہ (فعل مع فاعل) ہے جو " کنتم " کی خبر کے طور پر آیا

ہے لھذا اسے محلاً منصوب کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں (کان" کا اسم اور خبر مل کر) جملہ اسمیہ (کنتم تکتمون) کا ترجمہ ہو گا "جو تم ہو چھپاتے"۔ اور اگر "کنتم تکتمون" کو ماضی استمراری کا صیغہ سمجھا جائے تو اس کا ترجمہ ہو گا: "جو تم چھپاتے رہتے تھے یا چھپایا کرتے تھے"۔ اور یہ پورا زیر مطالعہ جملہ (ع۴) بذریعہ واو العطف اس سے پہلے جملے (ع۳) کا ہی حصہ ہے اور یہ دونوں جملے (ع۳، ع۴ مندرجہ بالا) "اَلَمْ اَقُلْ" کے مقول ہیں۔ اس لیے "و اَعْلَم ....." سے پہلے عدمِ وقف کی علامت (لا) ڈالی جاتی ہے۔

۲:۲۳:۳ الرسم

آیت زیرِ مطالعہ کے (قریباً) تمام کلمات کا رسم معتاد (املائی) اور رسم قرآنی (عثمانی) یکساں ہے۔ بلکہ "انبئونی" (۲:۲۲:۳ (۳)) کے برعکس یہاں "انبئھم" اور "باسمائھم" میں ھمزہ کا مرکز (کرسی) بصورت "یاء کا نبرہ (دندانہ)" بھی رسم عثمانی اور رسم املائی میں یکساں ہے۔ البتہ بلحاظ رسم اس (آیت) کے صرف دو کلمات "یادم" اور "السموت" وضاحت طلب ہیں کیونکہ ان کا رسم املائی اور رسم عثمانی مختلف ہے۔

(۱) "یادم" (جسے عام عربی املاء میں "یَا آدمُ" لکھا جائے گا) قرآن کریم میں "یا" (حرفِ ندا) کے الف کے حذف کے ساتھ لکھا جاتا ہے (یعنی صرف "ب (ی)" کی صورت میں) اور لفظ "آدم" کا پہلا ھمزۂ مفتوحہ (یہ دراصل "ءَادُمُ" تھا) بھی کتابت سے محذوف ہو جاتا ہے۔ پھر ضبط کے ذریعے "یا" کا الف اور "ادم" کا ابتدائی ھمزہ محذوفہ پڑھنے کے لیے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور لفظ "آدم" منادیٰ ہو کر یعنی بصورت "یٰادم" قرآن کریم میں کل پانچ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اس کا رسم عثمانی یہی (یادم) ہے۔

(۲) " السمٰوٰت " جس کی عام املاء " السماوات " ہے ۔ قرآن مجید میں اسے ہر جگہ (بالعموم) بحذف الالفین (لبعد المیم والواو) لکھا جاتا ہے یعنی بصورت " السموت " ۔ (مقاماتِ اختلاف کا ذکر اپنی جگہ آئے گا) ۔ پھر ضبط کے ذریعے ان دونوں محذوف " الفوں " کو پڑھنے کے لیے ظاہر کیا جاتا ہے ۔ نیز دیکھئے ۲ : ۲۲ : ۳ میں نمبر (۱) ۔

۲ : ۲۲ : ۴ الضبط

آیت زیرِ مطالعہ میں صرف تین کلمات (" لکم " ، " غیب " اور " و ") ایسے ہیں جن کے ضبط میں کسی ملک میں اختلاف نہیں ہے سوائے اس کے کہ مختلف حرکات کے لیے علامت کی شکل مختلف استعمال کی جاتی ہے ۔ باقی کلمات کے ضبط میں وہی ھمزۂ قطع و وصل یا کتابتِ ھمزہ یا اقلابِ نون بمیم یا حروفِ علت پر علامتِ سکون کے استعمال وغیرہ کا اختلاف موجود ہے ۔ اور جس پر ابھی اوپر ۲ : ۲۲ : ۴ میں مفصل اصولی بحث ہو چکی ہے ۔ بہرحال اس (زیرِ مطالعہ) آیت کے کلمات کے ضبط میں اختلاف کی حسب ذیل صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ۔

قَالَ ، قَالَ ، قَالَ / يٰادَمُ ، يٰٓاٰدَمُ يٰٓـادَمُ /

اَنْبِئْهُمْ اَنْبِئْهُمْ ، أَنْبِئْهُمْ ، ءَانْبِئْهُمْ /

بِاَسْمَآئِهِمْ ، بِاَسْمَائِهِمْ ، بِأَسْمَآئِهِمْ ، بِءَاسْمَآئِهِمْ /

فَلَمَّا ، فَلَمَّا ، فَلَمَّا / اَنْبَاَهُمْ ، اَنْبَاَهُمْ ، أَنْبَأَهُمْ /

ءَانْبَاَهُمْ / بِاَسْمَآئِهِمْ مثل سابق / قال مثل سابق /

أَلَمْ، أَلَمْ، ءَ أَلَمْ / أَقُلْ لَكُمْ، أَقُلْ لَكُمْ /
أُقُلْ لَكُمْ، ءَ أَقُلْ لَكُمْ / إِنِّيْ، إِنِّيْ، إِنِّيْ، إِنِّيْ /
أَعْلَمُ، أَعْلَمُ، ءَ أَعْلَمُ / غَيْبَ، غَيْبَ /
السَّمٰوٰتِ، السَّمٰوَاتِ (ترکی۔ خلاف رسم عثمانی)، السَّمٰوٰتِ،
السَّمٰوٰتِ / وَالْاَرْضِ، وَالْاَرْضِ، وَالْاَرْضِ /
وَاَعْلَمُ (مثل سابق) / مَا، مَا / تُبْدُوْنَ، تُبْدُوْنَ،
تُبْدُوْنَ / وَمَا، مَا / كُنْتُمْ، كُنْتُمْ، كُنْتُمْ /
تَكْتُمُوْنَ، تَكْتُمُوْنَ، تَكْتُمُوْنَ۔

نوٹ: همزہ محذوفہ مفتوحہ جس کے بعد الف ہو کو بذریعہ ضبط ظاہر کرنے کے کئی طریقے رائج ہیں یعنی ءَا = اٰ = أٰ = ءَا = ءا (زرد گول نقطہ) = ءَا = آ۔ تاہم آخری شکل (آ) کو صرف عام عربی املاء میں استعمال کیا جاتا ہے مگر قرآن کریم کی کتابت میں اسے استعمال نہیں کرتے بلکہ بعض اہل علم نے اسے ("آ" لکھنے کو) غلط قرار دیا ہے (دیکھئے مصری مصحف (امیریہ) کے کسی ایڈیشن کے آخر پر "التعریف بھذا المصحف") اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی کتابت میں تجوید کے لیے چھوٹی بڑی مد (~ ، ~) خاص مقصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ دیکھئے اوپر "یا دم" کا ضبط۔ ہم نے جہاں "آدم" لکھا ہے وہ رسم املائی ہے۔ اور "رسم" یا "اعراب" یا "لغۃ" کی بحث میں محض سمجھانے کی آسانی کے لیے لکھا ہے تاہم اصل متن (مکمل آیت یا آیات) لکھتے ہوئے رسم عثمانی کے مطابق ہی لکھا گیا ہے۔

انسانی حقوق
سیرتِ طیبہ کی روشنی میں (۲)

از قلم: سید شبیر حسین زاہد

اب معاشرے کے مختلف طبقات کے حقوق علیحدہ علیحدہ بیان کئے جاتے ہیں' تاکہ اسلامی تعلیمات اور سیرتِ طیبہ کا مطالعہ عنوان کے حوالہ سے مکمل ہو سکے۔

(ا) والدین کے حقوق:

(ا) نیک سلوک: وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (البقرہ: ۸۳' النساء: ۳۶' بنی اسرائیل: ۲۳) "اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو"۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا (الاحقاف: ۱۵) "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی ہے"۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا (العنکبوت: ۸) "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تاکید کی ہے"۔

(ب) شکر گزاری: "(ہم نے انسان کو وصیت کی) کہ وہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرے"۔ (لقمان: ۱۴)

(ج) گفتگو میں ادب و نرمی: "پس اُن کو اُف تک نہ[1] کہو اور نہ اُن کو جھڑکو' اور اُن سے ادب کے ساتھ گفتگو کرو" (بنی اسرائیل: ۲۳)

(د) عاجزی: "اور اُن دونوں (ماں اور باپ) کے آگے رحم کے ساتھ عاجزی کا بازو جھکاؤ"۔ (بنی اسرائیل: ۲۴)

۱۔ حضرت حسنؓ کا قول ہے کہ اگر اُف سے نیچے بھی کوئی درجہ ماں باپ کو تکلیف دینے کا ہوتا تو اللہ جل شانہ اس کو بھی حرام قرار دے دیتے (تفسیر دُرِّ منثور از دیلمی بحوالہ حقوق العباد)

(ہ) اطاعت بالمعروف: "اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے"۔ (العنکبوت: ۸) "اور اگر وہ دونوں تم سے اس بات پر جھگڑیں کہ میرے ساتھ شریک ٹھہرائیں جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے' تو ان کی اطاعت مت کر!" (لقمان: ۱۵)

(و) والدین کے لئے دعا: وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل: ۲۴) "اور کہہ' میرے رب تو ان پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹا ہوتے پالا"۔

(ز) والدہ کا خصوصی حق: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "تیرے حُسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق تیری ماں ہے' (تین دفعہ فرمایا) اور پھر تیرا باپ" (سنن ابوداؤد)۔ "ماں کی خدمت مرتبہ جہاد کے برابر ہے"۔ (سنن نسائی)

(ح) والد کا خصوصی حق: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا: "تم اور تمہارا مال تمہارے والد کی ملکیت ہے"۔ (ابوداؤد)۔ "والد راضی تو اللہ راضی' والد ناراض تو اللہ ناراض"۔ (ترمذی)

(ط) ماں باپ کی خدمت کا درجہ جہاد کے برابر (یا اس سے زیادہ) ہے (مسلم)۔ جہاد پر جانے سے پہلے والدین کی اجازت ضروری ہے (سنن ابوداؤد)۔ مرحوم والدین کی خدمت یہ ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت کی جائے' ان کے نامکمل وعدوں کو پورا کیا جائے' ان کی قرابتوں کو قائم رکھا جائے اور ان کے دوستوں کی عزت کی جائے (سنن ابی داؤد)۔

(ی) ماں باپ کے لئے خرچ کرنا: قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ..... (البقرہ: ۲۱۵) "فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو پس ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے.....!"

(ک) محبت کی نظر سے دیکھنا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے والی اولاد جب بھی رحمت (محبت) کی نظر سے ماں باپ کو دیکھے تو ہر نظر کے عوض اللہ جل شانہ' اس کے لئے مقبول حج کا ثواب لکھ دیتے ہیں..... اگرچہ روزانہ سو بار اسی طرح دیکھے" (مشکوۃ از بیہقی)

(ل) والدین کی طرف توجہ نفلی عبادت سے بہتر ہے: ایک دفعہ حضرت جریجؒ ماں کی پکار سن کر بھی عبادت میں مشغول رہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "والدہ کے

بلانے پر جواب دینا رب کی نفلی عبادت سے بہتر ہے۔" (فتح الباری)

(۲) اولاد کے حقوق:

(ا) تحفظِ جان: وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ (الانعام: ۱۵۱) "اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو"۔

(ب) رضاعت و حضانت: "جو باپ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دودھ پیئے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں"۔ (البقرہ: ۲۳۳)

(ج) شفقت و محبت: حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام حسنؓ کو چوم رہے تھے۔ ایک اعرابی نے دیکھ کر کہا کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے آج تک کسی کو نہیں چوما۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے ارشاد فرمایا: "جو رحم نہیں کرتا' اس پر رحم نہیں کیا جائے گا"۔ پھر فرمایا: "اگر اللہ تیرے دل سے شفقت کو نکال دے تو میں کیا کر سکتا ہوں"۔[۱۱]

(د) عدل و برابری: ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے ایک کو غلام ہبہ کر دیا اور حضورؐ کو اس پر گواہ بنانا چاہا تو حضور اکرمؐ نے دریافت فرمایا: "کیا تو نے اپنے ہر لڑکے کو ایک غلام ہبہ کیا ہے؟" اس صحابی نے عرض کیا: "نہیں"۔ حضور نبی کریم رؤف و رحیمؐ نے فرمایا: "میں تو ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا"۔ (ابوداؤد کتاب البیوع)

(ہ) رزقِ حلال کی فراہمی: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ طَلَبُ الْحَلَالِ جِهَادٌ (رزقِ حلال کی طلب جہاد ہے)۔ ایک دفعہ حضرت حسنؓ نے صدقہ کی کھجور منہ میں ڈال لی تو حضور اکرمؐ نے ان کے منہ میں انگلی ڈال کر تے کروا دی اور فرمایا: "صدقہ آلِ محمدؐ پر حرام ہے"۔ اس طرح آپؐ اولاد کو حرام رزق سے بچاتے تھے۔[۱۲]

(و) اچھی تعلیم و تربیت: ارشاد نبویؐ ہے کہ باپ کا کوئی عطیہ بیٹے کے لئے اس سے بڑھ کر نہیں کہ وہ اس کی اچھی تعلیم و تربیت کرے (ترمذی' مسند امام احمد)۔ رسولِ خدا

۱۱۔ بالترتیب بخاری کتاب التوحید' بخاری کتاب الادب

۱۲۔ اگرچہ صدقہ اور زکوٰۃ عام مستحق مسلمانوں پر حرام نہیں مگر اولادِ رسولؐ پر حرام ہے۔ اسی سے دوسرے حلال و حرام کے جواز و عدم جواز پر قیاس کرنا چاہئے۔

نے فرمایا: "جس شخص نے دو تین بیٹیاں یا بہنیں پائیں، انہیں تعلیم دلائی ...... وہ جنت میں جائے گا"۔ (ابو داؤد، ترمذی)

(ز) اولاد کے حق میں دعا: ا۔ "اور (رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما"۔ (الفرقان۔۶)

۲۔ "اور (اے خداوند) میرے لئے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا"۔ (الاحقاف)

(ح) تربیتِ اخلاق: حضور سرورِ عالمینؐ کا ارشاد ہے: "باپ کا اپنے بچّہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے"۔ (مسلم)

(ط) عفوو درگزر کرنا: ارشادِ خداوندی ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں سو ان سے بچتے رہو اور اگر تم (انہیں) معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے"۔ (التغابن: ۱۴)

(ی) میراث دینا: ارشاد باری ہے: یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَولَادِکُم..... فَلَھَا النِّصفُ (النساء: ۱۱) "اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تاکیدی حکم دیتا ہے، ایک مرد کے لئے دو حصّے عورتوں کے حصّہ کے برابر۔ پھر اگر اولاد میں دو یا اس سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لئے اس کی دو تہائی ہے اس ترکہ میں سے جو چھوڑا اور اگر اکیلی ہو تو اس کے لئے (مرد سے) نصف حصّہ ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جب بچہ پیدا ہو کر روئے (اور مر جائے) تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور وارث قرار دیا جائے (بشرطِ زندگی)"۔

(ک) نکاح: رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "جس کے ہاں لڑکا پیدا ہو اسے اس کا اچھا نام رکھنا چاہیے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کرنی چاہئے۔ اگر وہ بالغ ہو اور اس کی شادی نہ ہو اور اس نے گناہ کیا تو اس کا گناہ باپ

ے سر ہے"۔ (بحوالہ اسلام کے کارہائے نمایاں ص ۲۴۰)

(ل) **قتلِ بنات کی ممانعت:** قتلِ بنات کا قیامت کو سختی سے حساب ہو گا جس کا ذکر یوں ہوا: وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر: ۹) "یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن کی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی ہو"۔

(م) **بیٹیوں سے خصوصی حُسنِ سلوک:** حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے: "بیٹیاں تمہاری بہترین اولاد ہیں" (مسند الفردوس)۔ "کوئی شخص کوئی چیز لے کر گھر میں داخل ہو تو پہلے وہ چیز لڑکی کو دے' پھر لڑکے کو"۔

(ن) **اولاد کے لئے خرچ کرنا:** حضرت اُمّ سلمہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "کیا اپنی اولاد پر خرچ کرنے کا بھی کوئی اجر ہے"؟ فرمایا: "یقیناً ہے!"۔ (بخاری)

(س) **عقیقہ:** رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لڑکے کی ولادت کے ساتھ عقیقہ ہے" (بخاری)۔ "جس کے ہاں بچہ پیدا ہو تو میں اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ اس کی طرف سے قربانی کی جائے[13,14]" (ابی داؤد)

۱۳۔ لڑکے کی طرف سے دو بکرے یا بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا یا بکری

۱۴۔ اولاد کا ماں باپ پر یہ بھی ایک حق ہے کہ اگر ذکور ہو تو اس کا ختنہ کروایا جائے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

عظمت قرآن

بزبان قرآن و صاحبِ قرآن

کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔ خود پڑھئے اور دوسروں تک پہنچایئے!

صفحات ۲۸' قیمت (عام ایڈیشن) -/۴ روپے' (اعلیٰ ایڈیشن) -/۷ روپے

شائع کردہ: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن

رسید کتب

----------(۱)----------

A Study of

AL-QURAN-UL-KARIM

By Lal Muhammad Chawala

چار مجلّدات پر مشتمل قرآن حکیم کا ترجمہ مع حواشی

○ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ خوبصورت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ

(انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے آج تک جو تراجم ہوئے ہیں' ان میں بلاشبہ یہ ایک بیش قیمت اضافہ ہے!)

----------(۲)----------

تہذیبِ اطفال

مفکر اسلام علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق تالیف

"تحفۃ الودود باحکام المولود" سے ماخوذ ولادت سے بلوغت تک کے احکام و آداب پر مشتمل

ایک مفید کتاب جس کا ہر صاحب اولاد مسلمان کو ضرور مطالعہ کرنا چاہئے!

تلخیص' ترجمہ و تخریج احادیث: ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

○ صفحات ۸۸ ○ قیمت ۲۱ روپے

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ' شاہ عالم مارکیٹ' لاہور

JUNE 1992 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 11
NO. 6

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ